# الرسالہ

ISSN 0970-180X

خاص نمبر
خلیج ڈائری

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

تاریخ صرف ماضی کی ایک داستان نہیں
تاریخ حال اور مستقبل کا نصیحت نامہ ہے

شمارہ ۱۷۴
مئی ۱۹۹۱

# تذکیر القرآن

جلد اوّل : سورۃ فاتحہ۔ سورۃ بنی اسرائیل
جلد دوم : سورۃ الکہف۔ سورۃ الناس

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

# خلیج ڈائری

## خلیج کی جنگ کے سبق آموز پہلو

مولانا وحید الدین خاں

مکتبہ الرسالہ ، نئی دہلی

## ۱۵ جنوری ۱۹۹۱

۱۵ جنوری ۱۹۹۱ کے اخبارات یہ خبر لائے کہ آج رات کو گیارہ بج کر انسٹھ منٹ (11.59) پر وہ ڈیڈ لائن ختم ہو جائے گی جو کویت سے عراقی فوج ہٹانے کے لیے اقوام متحدہ نے مقرر کی تھی۔ اس کے بعد فوراً امریکہ کو یہ حق ہو جائے گا کہ وہ عراق پر اپنی پوری طاقت کے ساتھ حملہ کر دے۔ ٹائمس آف انڈیا (۱۵ جنوری) کے ایڈیٹوریل کی سرخی تھی ——— الٹا شمار صفر پر پہنچنے والا ہے :

Countdown to zero

امریکی نیوز ایجنسی اے پی کے نمائندہ نے سعودی عرب میں اس مقام کا دورہ کیا جہاں امریکہ نے فوجی اڈہ بنایا ہے۔ یہاں انتظام کیا گیا ہے کہ جنگ شروع ہونے کی حالت میں عراق کے اوپر رات دن مسلسل بمباری کی جائے تاکہ یا تو صدر صدام حسین ہتھیار ڈال دیں یا عراق کو اسٹون ایج میں پہنچا دیا جائے۔

اے پی کے نمائندہ سے گفتگو کرتے ہوئے امریکی میجر کوگلان (J.J. Coghlan) نے کہا کہ یہاں ہر آدمی اپنی گھڑی کو ہر وقت دیکھتا رہتا ہے تاکہ یہ معلوم کرے کہ ۱۵ تاریخ کو کون سا دن ہے۔ ہر ایک اپنے آپ کو ارجنٹ صورت حال میں محسوس کر رہا ہے :

Everybody looks at the watch all the time to see which day the 15th is. There's a sense of urgency.

جس طرح اقوام متحدہ کے رزولیوشن ۶۷۸ (۲۹ نومبر ۱۹۹۰) کے مطابق، امریکہ نے عراق کو الٹی میٹم دیا کہ وہ ۱۵ جنوری ۱۹۹۱ تک کویت سے اپنی فوجیں ہٹا لے، ورنہ اس کے اوپر حملہ کرکے اس کو برباد کر دیا جائے گا، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے موجودہ دنیا کی ایک عمر مقرر کر دی ہے اور اعلان فرمایا ہے کہ اس متعین وقت تک لوگ اپنی اصلاح کر لیں۔ اس کے بعد دنیا کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔ اور ہر ایک کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ خدا کی عدالت میں حاضر ہو کر اپنے عمل کا حساب دے۔

اگر لوگوں کو اس خدائی اعلان کا شعور ہو تو ہر آدمی ارجنسی کے احساس (sense of urgency) میں زندگی گزارنے لگے۔ ہر آدمی اپنا محاسبہ کرنے میں لگ جائے۔ ہر آدمی اپنے قول و عمل کا نگراں بن جائے۔ ہر آدمی اپنا دن اس طرح گزارے گویا کہ وہ شام تک نہیں رہے گا۔ اور شام اس طرح گزارے گویا اگلی صبح اس کے لیے آنے والی نہیں۔ لوگ قیامت کے آنے سے پہلے اپنے آپ کو قیامت میں کھڑا ہوا محسوس کرنے لگیں۔

## ۱۶ جنوری ۱۹۹۱

آج کل سب سے بڑا موضوع خلیج کا بحران ہے۔ ہر شخص عراق اور کویت کے مسئلہ پر بات کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ عراق ایک بڑا ملک ہے اور کویت اس کے مقابلہ میں بہت چھوٹا ملک۔ عراق کا رقبہ ۱۶۸۸۰۸ مربع میل ہے۔ جب کہ کویت کا رقبہ صرف ۶۸۸۰ مربع میل۔ عراق نے اپنی تیل کی دولت کے بڑے حصہ کو فوجی مدوں میں خرچ کر کے ۱۰ لاکھ کی طاقت ور فوج بنالی ہے، دوسری طرف کویت کے پاس عملاً کوئی فوج نہیں۔ اس فرق سے فائدہ اٹھا کر عراق کے حکمراں صدام حسین نے اپنی ایک لاکھ فوج ۲ اگست ۱۹۹۰ کو کویت کے اندر داخل کر دی۔ انھوں نے بزور کویت کو عراق میں ملا کر اعلان کر دیا کہ "کویت عراق کا ۱۹ واں صوبہ ہے"۔

اس کے بعد اقوام متحدہ متحرک ہوئی۔ مختلف ملکوں نے عراق کے اس جارحانہ اقدام کی مذمت کی۔ یہاں تک کہ امریکہ کی قیادت میں پورے عراق کا فوجی محاصرہ کر لیا گیا۔ عراق کی ۹۵ فی صد آمدنی کا انحصار تیل کی فروخت پر ہے۔ مگر عراقی تیل سے بھرے ہوئے ٹینکر سمندر میں کھڑے ہو گئے۔ زرعی اور صنعتی پسماندگی کی وجہ سے عراق فوجی ہتھیاروں سے لے کر دوا اور غذا تک ہر چیز باہر سے منگاتا ہے، ان کا آنا بھی بند ہو گیا۔

اب عراق کے حکمراں صدام حسین روزانہ امریکہ کے خلاف تیز و تند بیانات جاری کر رہے ہیں۔ ٹائمس آف انڈیا (۲۱ اگست ۱۹۹۰) کے مطابق، صدام حسین نے اس تجویز کو نامنظور کر دیا کہ وہ کویت کی حیثیت کے بارہ میں امریکہ سے بات چیت کریں۔ انھوں نے پُر جوش طور پر کہا کہ کیا کویت امریکہ کا ۵۲ واں صوبہ ہے:

Is Kuwait the 52nd state of the United States?

جواب کی یہی قسم ہے جس کو دھاندلی کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کویت اگر امریکہ کا ۵۲ واں صوبہ نہیں تو وہ عراق کا بھی ۱۹ واں صوبہ نہیں۔ صدام حسین عین اسی چیز کے لیے امریکہ کو متہم کر رہے ہیں جس میں وہ خود شدید تر انداز میں مبتلا ہیں۔

آج دنیا کے بیشتر لوگ اسی قسم کی دھاندلی کر رہے ہیں۔ کاش لوگ جانتے کہ اُسی بات کی قیمت ہے جو خدا کے یہاں قیمتی ٹھہرے۔ مومن وہ ہے جو اُن الفاظ کو آج ہی بے قیمت سمجھ لے جو کل خدا کے یہاں بے قیمت ہونے والے ہیں۔ جو آج آزادانہ طور پر اُس بات کو مان لے جس کو کل وہ مجبورانہ طور پر مانے گا، مگر اس وقت کا ماننا کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔

۱۷ جنوری ۱۹۹۱

ہندستانی وقت کے مطابق، آج صبح ساڑھے تین بجے وہ وقت آگیا جس کا اندیشہ تھا۔ امریکی فوجوں نے عراق کے اوپر باقاعدہ حملہ کردیا۔ فجر کی نماز سے پہلے بی بی سی (لندن) کے ذریعہ ریڈیو سے یہ خبر معلوم ہوگئی۔ یہ بھی کیسی عجیب بات ہے کہ رات کے وقت عراق میں ایک واقعہ ہوتا ہے۔ اس کے چند منٹ بعد لندن سے اس کی خبر نشر ہو جاتی ہے اور ایک لمحہ کے اندر ساری دنیا اس کو جان لیتی ہے۔

اپنی مختصر سی زندگی میں دو بڑی جنگیں دیکھنا میرے لیے مقدر تھا۔ دوسری عالمی جنگ جس کا قائد برطانیہ تھا۔ اور پھر موجودہ جنگ جو گویا تیسری عالمی جنگ ہے اور جس کی قیادت امریکہ کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ ۲۸ ملک عملاً شریک ہیں۔ بقیہ ملکوں کی اکثریت بھی نظری طور پر شریک ہے، کیوں کہ امریکہ نے یہ جنگی اقدام اقوام متحدہ کے فیصلہ کے تحت کیا ہے۔ دوسری عالمی جنگ باقاعدہ طور پر یکم ستمبر ۱۹۳۹ کو شروع ہوئی جب کہ ہٹلر کے تحت جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کردیا۔ چند دن کے بعد الٰہ آباد کے انگریزی اخبار پائنیر (pioneer) نے اپنے پہلے صفحہ پر اس کی خبر دیتے ہوئے اس کی جو سرخی قائم کی وہ اب تک مجھے یاد ہے۔ اس کے الفاظ غالباً یہ تھے :

Poland in Germany's hand

یہ تباہ کن جنگ چند سال تک جاری رہی۔ بے شمار جانی و مالی نقصان کے بعد آخر کار جو ہوا وہ یہ کہ ہٹلر کی خودسری مایوسی میں تبدیل ہوگئی۔ ۳۰ اپریل ۱۹۴۵ کو اس نے اپنی محبوب عورت کے ساتھ برلن کے کھنڈر پر خودکشی کرلی :

> Isolated and reduced to despair, Hitler married his mistress, Eva Braun, on April 30, 1945 and comitted suicide with her in the ruins of the chancellery. (19/1011)

بظاہر حالات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عراق کے ڈکٹیٹر کا انجام بھی ایک یا دوسری صورت میں وہی ہونے والا ہے جو جرمنی کے ڈکٹیٹر کا ہوا تھا۔ عراق کی طاقت اور امریکہ کے زیر قیادت اتحادیوں کی طاقت میں وہی فرق ہے جو چیونٹی اور ہاتھی میں ہے۔ اس فرق کے ساتھ عراق کا جنگ میں کودنا صرف خودکشی ہے نہ کہ بہادری۔

عراق کے پاس زیادہ تر روایتی ہتھیار ہیں جو اس نے روس سے یا دوسرے مغربی ملکوں سے خرید کر حاصل کیے ہیں جب کہ امریکہ کے ہتھیار اس کے اپنے بنائے ہوئے ہیں۔ "خریدے ہوئے" ہتھیاروں کے ذریعہ کوئی ملک ایک ایسی قوم پر فتح حاصل نہیں کرسکتا جس نے اپنے ہتھیار خود بنائے ہوں۔

۱۸ جنوری ۱۹۹۱

ہندستان ٹائمس (۱۸ جنوری) میں مسٹر رے (A.K. Ray) کا ایک مضمون چھپا ہے۔ مضمون نگار نے صدام حسین کے اقدام کو دیوانگی (madness) اور احمقانہ قسم کا غلط اقدام (stupid misadventure) بتایا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ صدام حسین کی عظیم فوج کے بارہ میں حال میں جو خبریں چھپی ہیں، وہ سب پروپگنڈے کی باتیں (propaganda ploy) ہیں۔ عراقی صدر کو اپنے غلط اعمال کی بھاری قیمت دینی ہوگی :

The Iraqi President will have to pay a terribly heavy price for his wrongdoings. (p. 13)

مضمون نگار کی یہ بات لفظ بلفظ درست ہے۔ صدام حسین کا اقدام بلاشبہہ ہلاکت کی چھلانگ ہے۔ صدام حسین جنون عظمت (paranoia) کے مریض ہیں۔ وہ عرب لیڈر بننے کے خبط میں مبتلا ہیں۔ اسی مقصد کے لیے انھوں نے ۱۹۸۰ میں ایران پر حملہ کیا تاکہ الجیرز ٹریٹی (۱۹۷۵) کو ختم کر کے شط العرب نیز خوزستان پر قبضہ کرلیں۔ مگر اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں نکلا کہ ایک ملین انسان مارے گئے۔ بے شمار لوگ زخمی ہوئے۔ عراق کے اوپر ۸۲ بلین ڈالر کا قرض ہوگیا۔ کویت پر حملہ (۲ اگست ۱۹۹۰) کے وقت ہر عراقی باشندہ ۴۲۸۴ ڈالر کا مقروض تھا۔ وغیرہ

آٹھ سالہ جنگ میں صدام حسین ایران کو مغلوب نہیں کر سکے تھے۔ مگر اپنے مجنونانہ جوش کی بنا پر انھوں نے اس سے سبق نہیں لیا۔ اور دوبارہ ناقابل فہم حماقت کے تحت عالمی سپر پاور (امریکہ) سے لڑنے کے لیے کھڑے ہوگئے۔

اس وقت ساری دنیا کے مسلم عوام جذباتی طور پر صدام حسین کی حمایت کر رہے ہیں۔ صدام حسین آج مسلم دنیا کے ہیرو ہیں۔ یہ واقعہ بتاتا ہے کہ موجودہ زمانہ کے عام مسلمان بھی اسی نفسیاتی بیماری میں مبتلا ہیں جس میں صدام حسین مبتلا ہیں۔ وہ اپنے جنون عظمت کی تسکین کے لیے صدام کے حامی بن گئے ہیں۔ حقیقی اسلام آدمی کو متواضع بناتا ہے۔ مگر خود ساختہ اسلام آدمی کی انا کو جگا کر اس کو جنون عظمت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ یہی موجودہ مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اپنی اس کمزوری کی بنا پر وہ حقیقت پسندی سے دور ہوگئے ہیں۔ وہ ہر اس آدمی کے پیچھے دوڑ پڑتے ہیں جو بڑے بڑے الفاظ بولے۔ خواہ عالم واقعہ میں ان الفاظ کی کوئی قیمت نہ ہو۔

## ۱۹ جنوری ۱۹۹۱

خلیج کی جنگ میں پہلی بار جدید وارفیر کی وہ صلاحیت سامنے آئی ہے جس کو عین نشانہ پر بمباری (pinpoint bombing) کہا جاتا ہے۔ الائیڈ فورس نے بغداد کی ڈیفنس بلڈنگ پر بم مارنا چاہا تو عین اسی مخصوص بلڈنگ پر بم گرا، جب کہ وہاں سیکڑوں دوسری بلڈنگیں بھی موجود تھیں۔ حتی کہ ٹی وی کے گنبد کو نشانہ بنایا تو ان کا بم صرف گنبد سے ٹکرایا اور بقیہ عمارت کو چھوڑ دیا۔ وغیرہ

لندن کی ایک رپورٹ (ٹائمس آف انڈیا ۱۹ جنوری) میں کہا گیا ہے کہ اب تک عراق پر چار ہزار ہوائی حملے کیے جا چکے ہیں۔ موصولہ تصویریں بتاتی ہیں کہ یہ حملے عین نشانہ پر لگے۔ اس انتہائی صحیح حملہ نے یہاں فوجی لوگوں کے اندر تموج کی کیفیت پیدا کر دی ہے :

At least four of these 4,000 air sorties yielded pictures of the sequence of highly accurate attacks that thrilled the military community, heralding a new era in warfare.

عین نشانہ پر بم کا گرنا ایک بے حد پیچیدہ عمل ہے۔ یہ ابھی تک ایک فوجی راز ہے۔ سادہ طور پر اس کا نظام یہ ہے کہ پہلے سٹلائٹ کے ذریعہ مطلوبہ مقام کا فوٹو لیا جاتا ہے۔ پھر زیر نشانہ عمارت کی تصویر کو ہوائی جہاز میں لگے ہوئے کمپیوٹر میں ڈال دیا جاتا ہے۔ جہاز فضا میں اڑ کر لیزر شعاعوں کے ذریعہ مذکورہ مقام کو معلوم کرتا ہے۔ کمپیوٹر کے اندر فیڈ کی ہوئی تصویر جب نشانہ کی تصویر سے مطابقت کرتی ہے تو کمپیوٹر مشین کو متحرک کرتا ہے اور بم اس تصویری نشانہ پر جا گرتا ہے۔ یہ انتہائی پیچیدہ اور تفصیلی عمل صرف منٹوں کے اندر انجام پاتا ہے۔

فوجی لوگ جب اس قسم کے واقعات کو دیکھتے ہیں تو ان کے اندر جدید ٹکنالوجی کے بارہ میں تھرل (تموج) کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ حالانکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اُس خدا کی قدرت پر تھرل کی کیفیت پیدا ہو جس نے کائنات میں اس قسم کے حیرت انگیز امکانات رکھے اور وہ انسانی ذہن بنایا جو اِن امکانات کو استعمال کر کے ایسے کارنامے انجام دے سکے۔

کیسی عجیب بات ہے کہ وہ عجائب (marvels) جو خالق کی یاد دلانے والے تھے، ان سے انسان صرف مخلوق کی یاد کی غذا حاصل کر رہا ہے۔ ان واقعات سے اگر صحیح سبق لیا جائے تو انسانی دنیا میں ایک حیرت ناک انقلاب برپا ہو جائے۔

## ۲۰ جنوری ۱۹۹۱

لاہور کے روزنامہ نوائے وقت (۱۸ جنوری) کے پہلے صفحہ پر ایک خبر نمایاں سرخی کے ساتھ چھپی تھی کہ کراچی سے خیبر تک تمام پاکستانی مسلمان امریکہ کی مخالفت اور صدام حسین کی حمایت میں متحد ہو گئے۔ اسی اخبار میں "امریکہ دشمن نمبر ۱" کے عنوان کے تحت ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ اس کا ایک پیراگراف یہ ہے:

"امریکہ کے صدر بش کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان کی بدولت پاکستان کے تمام طبقے اور تمام مکاتب فکر پہلی دفعہ امریکہ دشمنی کے حوالے سے ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا ہو گئے ہیں۔ اس وقت پوری پاکستانی قوم امریکہ کو عالم اسلام کا دشمن نمبر ۱ سمجھ رہی ہے۔ سمجھتی تو شاید پہلے بھی رہی ہے۔ لیکن اس کا بھرپور اور متفقہ اظہار پہلی دفعہ (امریکہ کے عراق پر حملہ کے بعد) ہو رہا ہے۔" (صفحہ ۲)

آج کل مسلمانوں کے اخباروں میں بار بار ایسی رپورٹیں اور مضامین چھپ رہے ہیں جن میں "عالمی اسلامی اتحاد" کی خبر دی جاتی ہے۔ مگر یہ اتحاد محض ایک منفی اجتماع ہے۔ اور منفی اجتماع اپنی حقیقت کے اعتبار سے کوئی اتحاد نہیں۔ وہ محض ایک وقتی قسم کی بھیڑ ہے نہ کہ کوئی حقیقی اور پائدار اتحاد۔ اس قسم کا اتحاد صرف قوم کی کمزوری کو بتاتا ہے نہ کہ فی الواقع اس کی قوت و طاقت کو۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں میں جب بھی کوئی بڑا اتحاد ہوا ہے، وہ منفی بنیاد پر ہوا ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں برصغیر ہند کے مسلمان "خلافت" کے نام پر متحد ہوئے۔ مگر یہ کوئی مثبت اتحاد نہ تھا، وہ صرف انگریز دشمنی کے جذبہ کے تحت ظہور میں آیا تھا۔ اسی طرح موجودہ صدی کے وسط میں مسلمان مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے متحد ہو گئے۔ یہ اتحاد بھی کوئی مثبت واقعہ نہ تھا۔ وہ تمام تر ہندو دشمنی کے جذبہ کے تحت برپا ہوا تھا۔ اب صدی کے آخر میں مسلمان پھر متحد نظر آرہے ہیں۔ مگر یہ اتحاد بھی صرف امریکہ دشمنی کے جذبہ کے تحت ظاہر ہوا ہے، اس اتحاد کے پیچھے کوئی مثبت بنیاد موجود نہیں۔ اس لیے وہ باقی رہنے والا بھی نہیں۔

موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما اس قسم کے اتحادی واقعات پر بار بار خوشیوں کے چراغ جلاتے ہیں۔ مگر شام کے جلائے ہوئے چراغ صبح کو بجھ جاتے ہیں۔ اور اس کے بعد ملت بدستور اختلاف و انتشار کے اندھیروں میں ڈوبی ہوئی نظر آنے لگتی ہے۔

مثبت بنیاد پر جمع ہونا حقیقی اتحاد ہے، منفی بنیاد پر جمع ہونا محض ایک بے معنی بھیڑ۔ اتحاد کسی قوم میں شعوری عمل سے آتا ہے اور بھیڑ صرف جذباتی الفاظ سے۔

## ۲۱ جنوری ۱۹۹۱

ٹائم (۱۵-۲۱ جنوری) "گلف اسپشل" کے طور پر شائع کیا گیا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ امریکہ اور عراق دونوں اپنی آخری حد پر جا چکے ہیں، اور بظاہر اب دونوں فریق جنگ کے لیے تیار ہیں، کیونکہ دونوں میں سے کوئی بھی اس مفروضہ بدنامی کو اپنے اوپر لینا نہیں چاہتا کہ اس نے دوسرے کے آگے ہتھیار ڈال دیے (۹-۱۰)

ٹائم نے لکھا تھا کہ صدام حسین اگر کویت سے اپنی فوجیں غیر مشروط طور پر واپس بلا لیں، تو یہ ان کے لیے آخری بہترین انتخاب (choice) ہوگا۔ کویت یہ اعلان کر چکا ہے کہ فوجوں کی واپسی کے بعد وہ عراق کی شکایت پر بات چیت کے لیے تیار ہے۔ حتی کہ صدام حسین کے سابقہ مطالبہ کے مطابق، عالمی امن کانفرنس بلانے کا امکان بھی موجود ہے۔

ٹائم کے مطابق، خود امریکہ نے کھلے طور پر یہ وعدہ کیا تھا کہ صدام حسین اگر کویت سے اپنی فوجیں واپس بلا لیں تو صدام مخالف اتحاد اس کے بعد عراق پر حملہ نہیں کرے گا۔ مزید یہ کہ جارج بش نے اس بات کا بھی اشارہ دیا تھا کہ عراق اپنے سرحدی جھگڑوں کے بارہ میں کویت سے بات چیت کر سکے گا، اور غالباً فلسطین کے مسئلہ پر ایک انٹرنیشنل کانفرنس بھی منعقد کر سکے گا (صفحہ ۱۲) سویت یونین اور فرانس وغیرہ بھی یہ کہہ چکے تھے کہ صدام حسین اگر کویت سے اپنی فوجیں ہٹا لیں تو ویسٹ ایشیا کے تمام مسائل کے مجموعی حل (package deal) کے بارہ میں اقوام متحدہ کے تحت کانفرنس کی جائے گی اور تمام مسائل کو حل کیا جائے گا۔ ٹائم نے یہ امکان ظاہر کیا تھا کہ اسرائیل پر دباؤ ڈال کر اس کو راضی کیا جائے گا کہ وہ ویسٹ بینک اور غازہ پٹی کو فلسطینیوں کے لیے خالی کر دے تاکہ وہ وہاں اپنی اسٹیٹ بنا سکیں (صفحہ ۱۴)

مگر صدام حسین نے ان تمام تجویزوں کو رد کر دیا۔ یہاں تک کہ جنگ شروع ہو گئی۔ اب مزید کچھ پانا تو درکنار، یہ یقینی ہے کہ صدام حسین کے پاس جو کچھ ہے، اس کو بھی وہ کھو دیں گے۔ اس دنیا میں بہترین عقلمندی یہ ہے کہ آدمی زیادہ کا مطالبہ کرے مگر وہ کم پر راضی ہو جائے۔ ٹکراؤ کے بغیر فریق ثانی جو کچھ دے رہا ہے، اس پر راضی ہو جانا مزید ترقی کا راستہ کھولتا ہے۔ اس کے برعکس آدمی اگر ٹکراؤ کا طریقہ اختیار کرے تو وہ حاصل شدہ چیز کو بھی ضائع کر دیتا ہے۔

جنگ سے پہلے صدام حسین کو جو کچھ مل رہا تھا، جنگ کے بعد وہ اس کو لینا چاہیں گے مگر اس وقت وہ کچھ بھی نہ پا سکیں گے۔ وقت گزر جانے کے بعد کوئی چیز کسی کو نہیں ملتی۔

## ۲۲ جنوری ۱۹۹۱

خلیج کی جنگ میں امریکہ کی زیر قیادت جو "ملٹی نیشنل فورس" بنی ہے، اس میں برطانیہ بھی شامل ہے۔ برطانیہ کے فوجی پائلٹ ٹارنیڈو (Tornado) نامی جہاز کے ذریعہ عراق پر حملے کر رہے ہیں۔ کچھ برطانی پائلٹوں نے اے پی کے نمائندہ کو اپنے جنگی تجربات بتائے۔

اسکوئڈرن لیڈر مسٹر میسن (Pablo Mason) نے کہا کہ جب ہم دشمن کے اوپر بمباری کرنے کے لیے اڑتے ہیں تو دشمن کو نقصان پہنچانے کے ساتھ ہر وقت یہ اندیشہ بھی رہتا ہے کہ ہم خود کسی متوقع یا غیر متوقع حادثہ میں تباہ ہو سکتے ہیں۔ اس وقت سارا معاملہ صرف سکنڈوں کا ہوتا ہے۔

ٹائمس آف انڈیا (۲۲ جنوری ۱۹۹۱) کی رپورٹ کے مطابق، پائلٹ میسن نے کہا کہ جنگ کے حالات میں ہمارے اندر مسلسل یہ شعور موجود ہوتا ہے کہ چند منٹوں میں وہ لمحہ آسکتا ہے کہ میں دنیا میں نہ رہوں :

> There is a constant awareness that in a few seconds' time you may not exist. (p. 7)

یہ احساس یا شعور جو ایک فوجی پائلٹ کے اندر جنگی حالات کے درمیان ہوتا ہے، وہی مومن کی مستقل زندگی ہے۔ مومن موجودہ دنیا کی زندگی کو امتحان سمجھتا ہے۔ خدا اس کو دنیا میں پیدا کر کے ہر لمحہ اس کی نگرانی کر رہا ہے، جیسے ہی خدا کی طرف سے مقرر کی ہوئی مدت پوری ہوگی، فوراً موت کا فرشتہ آجائے گا تا کہ اس کی روح قبض کرے اور اس کو دنیا سے نکال کر آخرت کے عالم میں پہنچا دے۔

جس آدمی کو یہ احساس ہو کہ اگلے سکنڈ میری موت آسکتی ہے، وہ بے حد چوکنا ہو جائے گا۔ ہر لمحہ کو وہ اپنے لیے آخری لمحہ سمجھے گا۔ وہ جینے سے زیادہ مرنے کو یاد کرے گا۔ وہ آج سے زیادہ کل کی فکر کرے گا۔ وہ آخری حد تک یہ کوشش کرے گا کہ دنیا کے ذریعہ آخرت کو کمائے نہ کہ دنیا کے ذریعہ دنیا کو۔ کیوں کہ دنیا بہت جلد ختم ہونے والی ہے۔ یہ صرف آخرت ہے جو اگلے لمحہ کے بعد اس کے لیے باقی رہے گی۔

"میں اگلے لمحہ نہ رہوں گا" یہ احساس آدمی کے لیے حال کے مقابلہ میں مستقبل کو زیادہ اہم بنا دیتا ہے۔ اس کی ساری توجہ موجودہ کے مقابلہ میں آئندہ کی طرف لگ جاتی ہے۔ وہ دنیا پرستی کو چھوڑ کر آخرت پسند انسان بن جاتا ہے۔

## ۲۳ جنوری ۱۹۹۱

آج کی اہم ترین خبر یہ ہے کہ عراق نے کویت کے تیل کے سیکڑوں کنوؤں میں آگ لگادی ہے جس کے نتیجہ میں وہاں آگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں اور فضا میں کالا دھواں چھا گیا ہے۔ ہندستان ٹائمس (۲۳ جنوری) کی پہلی سرخی یہ تھی کہ کویت کے تیل کے کنویں اڑا دیے گئے (Kuwait oilwells blown up) غالباً صدام حسین کو اب یہ یقین نہیں رہا ہے کہ وہ کویت کو اپنے قبضہ میں رکھ سکتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے کویت کے تیل کے کنوؤں کو برباد کرنا شروع کر دیا ہے۔ تاکہ کویت کو چھوڑنا ہو تو اس طرح چھوڑیں کہ وہاں کچھ باقی نہ رہے۔ تقریباً ۳۵ ملین گیلن تیل انھوں نے سمندر میں بہا دیا۔

صدام حسین نے حال میں عراق کے جھنڈوں پر اللہ اکبر لکھوایا تھا۔ وہ اپنی موجودہ جنگ کو اسلامی جہاد کہتے ہیں۔ ان کے اس قسم کے نعروں سے متاثر ہو کر ساری دنیا میں مسلمانوں کی اکثریت اس فریب میں پڑ گئی کہ واقعتہً یہ اسلام اور کفر کی جنگ ہے۔ مگر جو لوگ خدا کی نعمتوں میں آگ لگائیں وہ کبھی اسلام کے مجاہد نہیں ہو سکتے۔ خلیفہ اول نے خلافت کا عہدہ سنبھالنے کے بعد اسامہ کی سرکردگی میں شام کی طرف مہم روانہ کی تو ان کو یہ ہدایت دی کہ تم لوگ وہاں کوئی درخت نہ کاٹنا (لا تقطعوا شجراً)

جنگ میں "ایک درخت" کاٹنا بھی منع ہے۔ پھر تیل کے کنویں کو جلانا تو اس سے ہزاروں گنا زیادہ بڑی برائی ہے۔ تیل کے کنویں کو جلانے سے صرف تیل کا قدرتی ذخیرہ ہی برباد نہیں ہوتا بلکہ اس سے جو دھواں نکلتا ہے وہ آس پاس کی پوری فضا کو مہلک گیس سے بھر دیتا ہے۔ تیل کا ذخیرہ کسی شخص کی ملکیت نہیں۔ وہ انسانیت کے لیے اللہ کا ایک قیمتی عطیہ ہے۔ وہ خدا کی ایک قیمتی امانت ہے۔ انسان اس کو استعمال کرنے کا حق رکھتا ہے مگر وہ اس کو ضائع کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ تیل کے ذخیرہ کو قصداً برباد کرنا خدا کی امانت میں ظالمانہ تصرف کرنے کے ہم معنی ہے جو بلاشبہہ ناقابل معافی جرم ہے (تفصیل کے لیے سائنس رپورٹر، نئی دہلی، مارچ ۱۹۹۱)

صدام حسین نے تیل کے کنوؤں میں آگ لگائی۔ تیل کو سمندر میں بہا کر نہ صرف انسانوں کے لیے بلکہ چڑیوں اور مچھلیوں تک کے لیے خطرناک مسائل پیدا کر دیے۔ اس کے باوجود مسلمان صدام حسین کو "مجاہد اسلام" کا لقب دیے ہوئے ہیں۔ جو لوگ اسلامی جہاد کا نام لیں مگر وہ اسلام کے احکام پر عمل نہ کریں، ایسے لوگوں کا کیس جہاد کا کیس نہیں بلکہ سرکشی کا کیس ہے۔ وہ سزا کے مستحق ہیں نہ کہ انعام کے مستحق۔

۲۴ جنوری ۱۹۹۱

خلیج کی ہولناک جنگ جاری ہے۔ دونوں طرف سے زبردست نقصانات ہورہے ہیں۔ انسان مارے جارہے ہیں۔ شہر تباہ ہورہے ہیں۔ سمندروں اور فضاؤں میں زہریلے اثرات پھیل جانے کی وجہ سے یہ حالت ہے کہ چڑیاں اور مچھلیاں تڑپ تڑپ کر مر رہی ہیں۔ اس تباہ کن جنگ پر صرف امریکہ کے زیر قیادت اتحادی فوجوں (الائیڈ فورسز) کا خرچ تقریباً ایک بلین ڈالر روزانہ ہے۔

جنگ لڑنے والے ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ وہ انسانی فلاح کے لیے جنگ لڑ رہے ہیں۔ خلیج کی موجودہ جنگ میں امریکہ کے زیر قیادت ۲۸ ملکوں کا اتحادی گروہ یہ کہتا ہے کہ وہ ایک کمزور قوم کے ساتھ ایک طاقت ور کی جارحیت کے خلاف لڑ رہا ہے۔ صدام حسین کے نزدیک اس جنگ کا مقصد ماضی کی غلطی کی اصلاح ہے یعنی کویت، جو اُن کے نزدیک عراق کا حصہ تھا، اس کو دوبارہ عراق میں شامل کیا جائے۔

۱۸۹۸ میں امریکن۔اسپینش جنگ چھڑی۔ اس وقت برطانیہ اور دوسرے یورپی ملکوں کے چھ سفیر واشنگٹن میں جمع ہوئے تاکہ امریکہ کے صدر میک کنلے کو جنگ سے اعراض پر آمادہ کریں۔ اس وقت دونوں کے درمیان جو بات چیت ہوئی، اس کا خلاصہ امریکی اخبار میں اس طرح بیان کیا گیا تھا کہ سفیروں نے کہا کہ ہم کو امید ہے کہ انسانیت کی خاطر آپ جنگ نہیں کریں گے۔ صدر نے جواب دیا کہ ہم کو امید ہے اگر ہم جنگ کریں تو یہ عین انسانیت کی خاطر جنگ ہوگی :

> Their ambassadors in Washington had a meeting with the US President, and the diplomatic exchanges were summarised by the New York World, of April 8, 1898, thus:
>
> Said the six ambassadors: "We hope for humanity's sake you will not go to war."
>
> Said Mr McKinley in reply: "We hope if we do go to war, you will understand that it is for humanity's sake."

پچھلے پچاس سال میں صرف "تیسری دنیا" میں تین سو چھوٹی بڑی لڑائیاں ہو چکی ہیں۔ ان میں سے ہر فریق اپنے آپ کو برحق بتاتا ہے۔ یہ صورت حال آخرت کو ایک لازمی اخلاقی ضرورت ثابت کر رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر آخرت نہ آئے تو یہ معلوم ہی نہ ہو کہ کون شخص حق پر تھا اور کون شخص ناحق پر۔

جنگ چھیڑنا اپنے اختیار میں ہے مگر جب جنگ چھڑ جائے تو اس کی تباہی اپنے اختیار میں نہیں ہوتی۔ عقلمند وہ ہے جو جنگ کی نوبت ہی آنے نہ دے۔

## ۲۵ جنوری ۱۹۹۱

ٹائمس آف انڈیا (۲۵ جنوری) میں اردو پریس کے بارہ میں ایک رپورٹ چھپی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ بمبئی کے اردو روزنامہ "اردو ٹائمز" پر مسلمانوں کے ایک مشتعل ہجوم نے سنگ باری کی۔ اس کی کاپیاں سڑک پر جلائی گئیں۔ اخبار کے ملازموں کو دھمکیاں دی گئیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اردو ٹائمز واحد اردو پرچہ ہے جس نے خلیج کی جنگ میں صدام حسین کی مذمت کی اور سعودی حکومت کی موافقت کی پالیسی اختیار کی۔ عدم برداشت کا یہ مزاج کسی حقیقی صحافت کو وجود میں لانے کے لیے قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔

آج کل تمام اردو اخبارات پر جوش طور پر صدام حسین کی حمایت کر رہے ہیں۔ ان کو صلاح الدین ایوبی اور "صدام مجاہد اسلام" لکھا جا رہا ہے۔ مسلم علاقوں میں صدام حسین کی تصویریں ہاٹ کیک کی طرح بک رہی ہیں۔ جن اردو اخبارات کی اشاعت بہت کم تھی، انھوں نے صدام حسین کی حمایت میں جذباتی مضامین لکھ کر اپنی اشاعت بہت زیادہ بڑھالی۔ مسلمانوں میں وہی اخبارات مقبول ہو رہے ہیں جن میں اِس قسم کی سرخیاں ہوں : "عراقی مزائلوں سے اسرائیل کی نیند حرام"۔ "بُش نے صدام کے آگے گھٹنے ٹیک دیے" وغیرہ

مسلم صحافت کا اور مسلمانوں کا یہ حال دیکھ کر مجھے دوسری عالمی جنگ کا واقعہ یاد آتا ہے۔ اس زمانہ میں ہندستان میں انگریزوں کی حکومت تھی۔ مسلمان انگریزوں سے بے حد متنفر تھے۔ جنگ میں جب ہٹلر کی فوجوں نے برطانیہ پر بم گرائے تو مسلمان بہت خوش ہوئے۔ اخبارات میں ایک اردو شاعر کی نظم چھپ کر بہت مقبول ہوئی۔ اس کا عنوان تھا "ہٹلر اعظم"۔ اس نظم میں ہٹلر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا تھا :

خبر لینے بکنگھم کی جو اب کی بار پھر جانا ہمارے نام کا بھی ایک گولہ پھینکتے آنا

یہی جذباتیت آج مسلمانوں میں شدت سے ابھر آئی ہے۔ مسلمانوں کو یہودیوں اور عیسائیوں سے سخت نفرت ہے۔ صدام حسین نے عیسائیوں (امریکہ) کے بارہ میں کہا کہ تم کو خلیج عرب میں غرق کر دیا جائے گا۔ اور اسرائیل کے اوپر کچھ اسکڈ (Scud) مزائل پھینک دیے۔ اس کے بعد مسلمان ایک طرف سے صدام حسین کی حمایت کرنے لگے۔ مگر یہ صرف سطحیت ہے۔ اس کا تعلق نہ اسلام سے ہے اور نہ عقل سے۔

مسلمانوں کے اس مزاج نے اردو صحافت کو انتہائی حد تک سطحی بنا دیا ہے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اردو اخبارات پڑھنے والا آدمی عالمی حقیقتوں سے اتنا ہی بے خبر رہتا ہے جتنا غالب اور ذوق کا دیوان پڑھنے والا آدمی سائنسی علوم سے۔

## ۲۶ جنوری ۱۹۹۱

ہندستان ٹائمس (۲۶ جنوری) میں صدام حسین کے اس محل کی تفصیل چھپی ہے جو انھوں نے بغداد میں بنوایا ہے۔ اس کی سرخی یہ ہے ـــــ صدام اپنے اس محل کے تہ خانہ میں ایک سال تک رہ سکتے ہیں :

Saddam can live 1 year in his bunker

اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ بغداد کا یہ صدارتی محل ۱۲۰ فٹ گہرا ہے اور پورا لوہے اور سمنٹ پر بنایا گیا ہے۔ وہ مکمل طور پر ایر کنڈیشنڈ ہے۔ اس میں نیچے سے اوپر تک لفٹ کا انتظام ہے۔ صدام حسین اس میں ایک سال تک ایٹمی حملہ سے محفوظ حالت میں رہ سکتے ہیں۔ اس میں ایک زمین دوز ذخیرۂ آب سے پانی پہنچایا جاتا ہے جو محل سے ۴۰۰ میٹر فاصلہ پر واقع ہے۔ وغیرہ

ایک فرنچ انجینیر جس نے اس محل کو بنانے میں مدد دی تھی، اس نے کہا کہ جب آپ لفٹ کے ذریعہ اس زمین دوز محل میں اتریں تو آپ ایک نہایت موٹے دروازہ سے گزر کر صدام حسین کے دفتر میں پہنچیں گے۔ صدام حسین کی اندرونی رہائش گاہ تک پہنچنے کے لیے کئی ایسے چیمبر سے گزرنا ہوتا ہے جو صرف کوڈ کے ذریعہ کھلتے ہیں۔ اس کے لیے میگنیٹک کارڈ استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح کے اور بہت سے خفیہ حفاظتی انتظامات ہیں جن کی تفصیل ڈیلی ٹیلی گراف نے چھاپی ہے۔

اس محل کے اندر ہر قسم کے تمام ضروری سامان کیے گئے ہیں۔ اس کے اندر ایسا کمیونی کیشن نظام ہے کہ صدام حسین اس کے اندر رہتے ہوئے تمام ملک سے اور پوری افواج سے مسلسل ربط قائم رکھ سکتے ہیں۔ وہ یہیں سے اپنی قوم کے نام ٹی وی پروگرام نشر کرتے ہیں۔ صدام حسین کوئی چیز اس وقت تک نہیں کھاتے جب تک کوئی دوسرا شخص ان کے سامنے اس کو چکھ نہ لے۔ فرانسیسی انجینیر نے کہا کہ صدام حسین اس زمین دوز محل میں لمبی مدت تک رہ سکتے ہیں اور یہاں سے جنگ کی رہنمائی کر سکتے ہیں :

Saddam Hussein could survive and function from this emplacement for a long time.

اس قسم کا زمین دوز محل بنا کر "ام المحارب" میں فتح کا خواب دیکھنا صرف صدام حسین کی کم عقلی کا ثبوت ہے۔ یہ "کلھیا میں گڑ پکانا" ہے۔ اور جو شخص کلھیا میں گڑ پکائے اس کا گڑ اِس عالم اسباب میں کبھی تیار نہیں ہوتا۔

۲۷ جنوری ۱۹۹۱

مکہ متفقہ طور پر مسلمانوں کا سب سے زیادہ مقدس مقام ہے۔ خلیج کا مسئلہ پیدا ہونے کے بعد ۲۲-۲۵ جمادی الآخرة ۱۴۱۱ھ (۹-۱۱ جنوری ۱۹۹۱) کو مکہ میں ایک عالمی کانفرنس ہوئی۔ اس میں سعودی عرب کے اور تمام دنیا کے علماء جمع ہوئے۔ تین دن کے غور و بحث اور مشورہ کے بعد "اعلان مكة المكرمة الى الامة الاسلامية" جاری ہوا۔ میرے سامنے اس کا وہ مستند متن ہے جو ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوة (۱۰ جنوری ۱۹۹۱ء) میں سات صفحات پر شائع ہوا ہے۔ اس روداد کا عنوان یہ ہے ــــــ عراقی فوج کے نام پیغام، صدام کی نافرمانی شرعی طور پر واجب ہے (رسالة الى الجيش العراق، عصيان صدام واجب شرعى)

رپورٹ کے مطابق، علماء کی موتمر نے متفقہ طور پر صدام کے خلاف یہ پکار بلند کی کہ تم فوراً کویت سے نکل جاؤ (اخرج يا صدام حسين من الكويت - اخرج الآن وليس غدا) اس میں کہا گیا ہے کہ عراقی فوج پر لازم ہے کہ وہ ظالم صدام کی اس کے ظلم میں حمایت نہ کرے (الواجب على جيش العراق الايطيع الظالم فى ظلمه) علماء اسلام کی اس عالمی کانفرنس نے متفقہ طور پر ساری دنیا کے مسلمانوں کو پکارا کہ وہ صدام حسین کا ساتھ نہ دیں، وہ خلیج میں صدام حسین کے اقدام کی مذمت کریں جس کے نتیجہ میں امریکہ اور مغربی طاقتوں کو خلیج میں آنے کا موقع ملا۔ اسی طرح دہلی میں بھی ہندستانی علماء کی کانفرنس ہوئی۔ اس میں بھی وہی باتیں کہی گئیں جو مکہ کی کانفرنس میں کہی گئی تھیں۔

اصولاً میں علماء کی اس پکار سے متفق ہوں۔ مگر عجیب بات ہے کہ اس پکار کے باوجود یہ ہوا کہ تقریباً ساری دنیا کے مسلمان صدام حسین کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ کسی بھی ملک کے مسلمانوں نے ان اعلانات اور ان اپیلوں کی پروا نہیں کی۔ عراق کی فوج کے بارہ میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ صدام حسین کا ساتھ دینے کے لیے مجبور تھی۔ مگر مسلم عوام تو آزادانہ طور پر خود اپنے فیصلہ کے تحت صدام حسین کے حامی بنے ہوئے ہیں۔ مسلم علماء اور مسلم عوام کے درمیان علٰحدگی کی اتنی بڑی مثال تاریخ میں کوئی اور نہیں ملتی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ خود مسلم علماء اور مسلم رہنماؤں نے ان قوموں کے خلاف مسلم عوام کو اتنا متنفر کر رکھا ہے کہ مسلمانوں کے لیے اب اس معاملہ میں غیر جذباتی رائے قائم کرنا ممکن نہیں۔ "نفرتِ مغرب" کی جو نفسیات مسلمانوں میں پیدا کی گئی ہے، اس کا نتیجہ وہی نکل سکتا تھا جو نکلا۔

۲۸ جنوری ۱۹۹۱

عراقی لیڈر کی بلند بانگ تقریریں اخباروں میں چھپ رہی ہیں۔ مثلاً انھوں نے کہا کہ عرب کے صحرا کو امریکیوں اور اتحادیوں کا قبرستان بنا دیا جائے گا۔ اس طرح کی باتیں مسلمانوں کو مجاہدانہ معلوم ہوتی ہیں۔ دوسری طرف سعودی عرب کے شاہ فہد کی بات مسلمانوں کو کمتر محسوس ہوتی ہے، کیونکہ انھوں نے امریکہ اور اس کے حلیفوں سے اتحاد کر لیا ہے۔ آج ایک صاحب نے بتایا کہ جامع مسجد کے علاقہ میں دیواروں پر ایسے پوسٹر لگائے گئے ہیں جن پر لکھا ہوا ہے: سعودی اور یہودی ایک سکہ کے دو رخ۔ ایک مسجد میں نماز ختم ہوئی تو ایک مسلمان نے ہاتھ اٹھا کر کہا: خدایا، سعود اور یہود کو ہلاک کر دے۔

خلیج کی نزاع میں کون حق پر ہے اور کون ناحق پر، اس کو سمجھنے کے لیے احادیث کا مطالعہ کیا جائے تو بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اس معاملہ میں سعودی عرب حق پر ہے اور دوسرا گروہ ناحق پر۔

امام الترمذی نے عمرو بن عوف رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کی ہے جس میں یہ قرینہ ملتا ہے کہ آخر زمانہ میں حق جزیرۂ عرب کی طرف ہوگا۔ اس روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دین حجاز میں پناہ لے گا جس طرح سانپ اپنی بل میں پناہ لیتا ہے (إن الدين ليأرز إلى الحجاز كما تأرز الحيّةُ إلى جُحرها) جامع الاصول فی احادیث الرسول، ۹ / ۲۴۱

دوسری روایت میں موجودہ حالات کے بارہ میں براہ راست اشارہ ملتا ہے۔ امام ابوداؤد نے "کتاب الملاحم" میں نقل کیا ہے کہ ذو مخبر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ تم آئندہ روم (عیسائیوں) سے پُرامن صلح کرو گے۔ پھر تم اور وہ دونوں ایک اور دشمن سے لڑو گے۔ پھر تم لوگوں کو فتح ہوگی۔ تم غنیمت حاصل کرو گے اور سلامت رہو گے۔ پھر تم لوگ واپس ہو گے، یہاں تک کہ تم ایک چراگاہ میں ٹھہرو گے جہاں ٹیلے ہوں گے۔ اس وقت عیسائیوں میں سے ایک شخص صلیب اٹھائے گا اور کہے گا کہ صلیب غالب آئی۔ پھر مسلمانوں میں سے ایک شخص کو غصہ آئے گا، وہ صلیب کو توڑ دے گا۔ اس وقت روم (عیسائی) عہد کو توڑ دیں گے اور جنگ کے لیے جمع ہو جائیں گے (سنن ابی داؤد، ۴ / ۱۰۹)

ان احادیث کی موجودگی میں مسلمانوں کی موجودہ روش یقینی طور پر درست نہیں۔ یہ صرف خواہش پرستی ہے نہ کہ قرآن و سنت کی پیروی۔

۲۹ جنوری ۱۹۹۱

انڈیا کے ایک انگریزی جرنلسٹ مسٹر ایس نہال سنگھ خلیجی جنگ کے زمانہ میں بغداد میں تھے۔ انھوں نے اپنے کچھ تجربات ہندستان ٹائمس (۲۹ جنوری) میں شائع کیے ہیں۔

وہ لکھتے ہیں کہ وہ کچھ اور صحافیوں کے ساتھ بغداد کے ممتاز ہوٹل الرشید میں مقیم تھے۔ مگر اس کا حال یہ تھا کہ کسی بھی بل کی ادائگی کے لیے صرف امریکی ڈالر ہی واحد قابل قبول سکہ تھا۔ یہاں امریکہ انتہائی نفرت کی علامت تھا، مگر عملاً امریکی ڈالر ہی بغداد پر حکومت کر رہا تھا :

Much as the United States was the hated symbol of Western might, the dollar ruled Baghdad.

یہ واقعہ علامتی طور پر بتاتا ہے کہ آج امریکہ اور ترقی یافتہ مغربی ممالک نے کس طرح تمام ذرائع پر قبضہ کر رکھا ہے۔ آپ امریکہ جائیے تو آپ دیکھیں گے کہ جو مسلمان امریکہ سے نفرت کرتے ہیں، وہی اپنے مستقبل کی تعمیر کے لیے امریکہ کو اپنا وطن بنائے ہوئے ہیں۔

ایسی حالت میں کرنے کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ مسلم دنیا کو جدید سائنسی میدانوں میں ترقی یافتہ بنایا جائے۔ مگر اس رخ پر کسی بھی مسلم ملک میں کوئی قابل ذکر کام نہیں ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلم ملکوں کو پٹرول کا خزانہ دے کر وہ اقتصادی طاقت دے دی تھی جس کے ذریعہ مسلم دنیا اپنے ترقیاتی منصوبوں کو مکمل کر سکے۔ مگر اس قدرتی خزانہ کو کچھ ممالک عیش وعشرت کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ اور کچھ ممالک یہ کر رہے ہیں کہ مغربی ملکوں سے خطرناک ہتھیار خرید کر خود مسلم ملکوں کے خلاف جارحانہ کارروائی کریں جس کی بدترین مثال وہ ہے جو عراق نے پیش کی ہے۔

صدام حسین کو پٹرول کی صورت میں مفت کی دولت مل گئی۔ اس دولت کو انھوں نے عراق کی ترقی میں نہیں لگایا۔ انھوں نے یہ کیا کہ روس، جرمنی، فرانس وغیرہ سے مہلک ہتھیار خرید کر پڑوسی ملکوں کو چیلنج کرنے لگے۔ اس کے برعکس اگر وہ اس قدرتی دولت کو ملک کی ترقی میں لگاتے تو عین ممکن تھا کہ عراق سکہ بھی وہی اقتصادی اہمیت حاصل کر لے جو آج امریکی ڈالر کو حاصل ہے۔

مسلمانوں کی بربادی کا سبب ان کی یہی داخلی کمزوری ہے نہ کہ کوئی بیرونی سازش۔ جو لوگ بیرونی سازشوں کی خبریں چھاپتے ہیں وہ صرف اپنی بے خبری کا ثبوت دے رہے ہیں۔

## ۳۰ جنوری ۱۹۹۱

لندن کے ایک مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ لندن کے تمام مسلمان خلیج کے موجودہ بحران میں صدام حسین کے حامی ہیں۔ صرف وہ تھوڑے سے مسلمان جن کو سعودی عرب سے پیسہ ملتا ہے، وہ سعودی عرب کا ساتھ دے رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ تو کوئی دلیل نہیں۔ اس بات کو الٹ کر اگر میں یہ کہوں کہ جو لوگ صدام حسین کے حامی ہیں ان کو عراق کی حکومت نے پیسہ دے رکھا ہے تو آپ کے پاس اس کا کیا جواب ہوگا۔

میں نے کہا کہ صدام حسین کو اگر حملہ کرنا تھا تو انھوں نے اسرائیل پر حملہ کیوں نہیں کیا۔ کویت پر کیوں حملہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ میں لندن میں عراق کے سفیر سے ملا تھا۔ میں نے پوچھا کہ آپ نے کویت پر کیوں حملہ کیا۔ سفیر نے کہا کہ اصل میں تو ہم اسرائیل پر حملہ کرنا چاہتے تھے، ہم نے سعودی عرب اور کویت سے کہا کہ اس معاملہ میں ہمارا ساتھ دو، مگر وہ ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ اس لیے ہم کو ایسا کرنا پڑا۔ میں نے کہا کہ آپ کو سفیر عراق سے پوچھنا چاہیے تھا کہ جب آپ نے سعودی عرب اور کویت کی حمایت کے بغیر ایران اور کویت پر حملہ کر دیا تو اسی طرح آپ ان کی حمایت کے بغیر اسرائیل پر بھی حملہ کر سکتے تھے۔

پھر انھوں نے کہا کہ اصل بات یہ ہے کہ عراقی سفیر کے بیان کے مطابق، عراق کو یہ خطرہ تھا کہ جب وہ اسرائیل پر حملہ کرے گا تو امریکہ کی فوجیں خلیج میں عراق کے خلاف آجائیں گی۔ میں نے کہا کہ آپ کو عراقی سفیر سے دوبارہ کہنا چاہیے تھا کہ امریکی فوج تو کویت پر حملہ کی صورت میں بھی مکمل طور پر خلیج میں آگئی ہے۔ پھر جس طرح کویت پر حملہ کے وقت آپ نے امریکی فوج کی آمد کی پروا نہیں کی، اسی طرح آپ اسرائیل پر حملہ کے وقت بھی امریکی فوج کی آمد سے بے پروا ہو کر اسرائیل کے خلاف اپنی فوجی کارروائی کر سکتے تھے۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی سوچ کتنی زیادہ سطحی ہوگئی ہے اور مسلمانوں کے لیڈر کس طرح مسلمانوں کی کم فہمی کا استغلال کر رہے ہیں۔

انسان کا حال یہ ہے کہ وہ ذاتی محرک کے تحت ایک اقدام کرتا ہے اور پھر اس کو جائز ثابت کرنے کے لیے اصول کی زبان بولتا ہے۔ وہ اپنی قیادت قائم کرنے کے لیے ہنگامے کھڑے کرتا ہے اور اس کو جہاد فی سبیل اللہ کا عنوان دیتا ہے۔ وہ قومی خواہش اور مادی مفاد کے تحت عمل کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ حق کی خاطر ایسا کر رہا ہے۔ ایسے لوگ سرکشی کی حد تک مجرم ہیں خواہ اپنی تبریہ کے لیے وہ کتنے ہی خوب صورت الفاظ بولتے رہیں۔

## ۳۱ جنوری ۱۹۹۱

ہندستان ٹائمس (۳۱ جنوری) میں نیویارک کی ڈیٹ لائن کے ساتھ ایک رپورٹ چھپی ہے۔ اس کا عنوان ہے ـــــــ مسلمانوں کو مغرب کی طرف سے غضب ناک ردعمل کا اندیشہ :

Muslims fear backlash

اس رپورٹ میں دوسرے حوالوں کے ساتھ مسٹر کلیم خواجہ کا بیان نقل کیا گیا ہے۔ وہ امریکہ کی ایسوسی ایشن آف انڈین مسلمس کے پریسیڈنٹ ہیں۔ امریکہ میں اس وقت ایک لاکھ (100,000) ہندستانی مسلمان رہتے ہیں۔ تاہم جو مسئلہ پیدا ہوا ہے وہ امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں میں بسنے والے تمام مسلمانوں کے بارہ میں ہے۔

رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ خلیج کی جنگ اور اس معاملہ میں مسلمانوں کے عام رویہ نے مغرب کی مسیحی قوموں میں ان کے خلاف سخت نفرت اور غصہ پیدا کر دیا ہے۔ وہ اس صورت حال کا شکار ہو رہے ہیں جس کو مسٹر خواجہ نے نسلی غضب ناکی (racist backlash) کا نام دیا ہے۔ مغربی ملکوں میں بسنے والے مسلمانوں کو نہ صرف تحقیر کا تجربہ ہو رہا ہے بلکہ ان کے خلاف تشدد کے واقعات بھی ہو رہے ہیں۔ مسلمانوں کے پرجوش مظاہروں نے خلیج کی جنگ کو اسلام اور عیسائیت کی جنگ بنا دیا ہے۔ اس نے غیر ضروری طور پر لوگوں میں صلیبی دور کی یادیں تازہ کر دی ہیں۔

مسٹر کلیم خواجہ نے اپنے بیان میں کہا کہ انھیں یہ پریشانی بھی ہے کہ خلیج کی جنگ سے پیدا شدہ اس صورت حال کا اثر جنوب ایشیائی ملکوں (مسلم ممالک) کی اقتصادیات پر بھی پڑے گا۔ انھوں نے کہا کہ اس کا ایک فوری اثر یہ متوقع ہے کہ تیسری دنیا کے ملکوں کی طرف ٹکنالوجی کی آمد رک جائے گی۔ یہ ان ملکوں کے لیے ترقی میں رکاوٹ کے ہم معنی ثابت ہوگا :

> One immediate effect that can be expected, will be a halt of the supply of technology to third world countries. That will prove to be a major setback. (p. 14)

امریکہ کے مسلم لیڈر کو موجودہ حالات کا یہ خطرناک نتیجہ نظر آتا ہے کہ مغربی ملکوں سے مسلم ملکوں کی طرف ٹکنالوجی کے آنے میں رکاوٹ پڑے گی۔ مگر میری نظر میں اس سے بڑا خطرہ دعوتی ہے۔ خلیج کی جنگ میں مسلمانوں کے پرجوش رویہ نے مسلمانوں اور مغرب کی مسیحی قوموں کے درمیان جو نفرت پیدا کی ہے، اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوگا کہ ان قوموں کے اندر اسلام کی اشاعت کا عمل رک جائے گا۔ یا کم از کم اس کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔

## یکم فروری ۱۹۹۱

ایک صاحب ایک اردو ماہنامہ لے کر آئے اور کہا کہ اس کے شذرات کو پڑھئے۔ اس میں لکھا ہوا تھا:
"امریکہ کے سخت رویہ اور مسلمانوں کو کچل دینے کی پالیسی نے عرب کی سرزمین کو اس وقت میدان کارزار میں تبدیل کر دیا ہے جہاں مانند آب مسلمان کا لہو ارزاں ہو گیا ہے اور تثلیث کے فرزند کھلم کھلا میراث خلیل میں دراندازی کر رہے ہیں۔ حالانکہ نبی آخر الزماں کا ارشاد ہے کہ اخرجوا الیھود والنصاری من جزیرۃ العرب (جزیرۂ عرب سے یہود و نصاریٰ کو نکال دو) اور قرآن مجید میں ان سے عدم موالات کا حکم دیا گیا ہے (لا تتخذوا الیھود والنصاری اولیاء) مگر آپ کے پیروؤں اور خالص وارثوں نے ان کو اپنا حلیف بنا لیا ہے۔ اور اب ان کا لشکر جزیرۃ العرب میں دندناتا پھر رہا ہے۔ اور مسلمانوں کے اہم اور مرکزی شہر ناگاساکی اور ہیروشیما بنتے جا رہے ہیں۔" (معارف فروری ۱۹۹۱)

میں نے انھیں عربی ہفت روزہ الدعوۃ کے شمارے (۳۱ جنوری، ۲۱ فروری ۱۹۹۱) دکھائے۔ ان میں الشیخ ابن باز نے اضطرار کے اسلامی اصول کے تحت غیر مسلم حکومتوں سے تعاون لینے کو جائز قرار دیا ہے۔ ان مضامین کو دیکھ کر وہ بگڑ گئے۔ انھوں نے کہا کہ جو مولوی اس قسم کی باتیں کرتے ہیں وہ سب سعودیہ کے نمک خوار ہیں، وہ امریکہ کے ایجنٹ ہیں۔

یہی موجودہ زمانہ کے مسلمانوں، خاص طور پر ان کے "لکھنے اور بولنے والے طبقہ" کا عام انداز ہے۔ یہ لوگ اختلافِ رائے کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اختلاف رائے پیش آتے ہی وہ طنز و تعریض اور عیب جوئی اور الزام تراشی کا انداز اختیار کر لیتے ہیں وہ تنقید کا جواب صرف تعییب سے دینا جانتے ہیں۔

اسلام میں صرف یہود و نصاریٰ کے جغرافی اخراج کا حکم نہیں ہے۔ اس سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ نفسیاتی امراض کے قلبی اخراج کا حکم دیا گیا ہے۔ ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ دوسرے مسلمان سے بغض نہ رکھے۔ وہ انانیت میں مبتلا نہ ہو۔ وہ بے انصافی نہ کرے، وہ دوسرے کا بدخواہ نہ بنے۔ وہ انتقامی جذبہ کو اپنے دل سے نکال ڈالے۔ وہ کسی کی کردارکشی نہ کرے۔ کسی کی نیت پر حملہ نہ کرے۔ وہ کسی کی طرف غلط بات منسوب نہ کرے۔ وہ کسی کی بربادی کے درپے نہ ہو۔

مگر اس دوسرے "اخراج" سے کسی کو کوئی دلچسپی نہیں۔ جغرافی اخراج کے چیمپین قلبی اخراج کے معاملہ میں بے حقیقت ثابت ہو رہے ہیں۔

## ۲ فروری ۱۹۹۱

ٹائمس آف انڈیا (۲ فروری) میں مسٹر شام لال کا ایک آرٹیکل چھپا ہے۔ خود آرٹیکل میں تو کوئی گہری بات نہیں، البتہ اس کا عنوان مجھے پسند آیا جو ان الفاظ میں ہے ـــــــ لڑائی جیتو اور امن ہار دو :

Win the War; Lose the Peace

خلیج کی جنگ میں پچھلے دو ہفتہ کے اندر تقریباً پچاس بلین ڈالر کا نقصان ہو چکا ہے۔ یہ نقصان مزید بڑھتا رہے گا۔ جنگ میں خواہ جو فریق جیتے، جہاں تک امن کا تعلق ہے، وہ بہر حال کھویا جا چکا ہوگا۔ بنگلہ دیش کی جنگ (۱۹۷۱) میں انڈیا جیت گیا۔ مگر اس کے بعد ملک میں تشدد اور مہنگائی اور کرپشن کا جو طوفان آیا اس نے امن اور سکون کو ہمیشہ کے لیے غارت کر دیا۔

یہی حال خلیج کی جنگ کے بعد بھی زیادہ بڑے پیمانے پر ہونے والا ہے۔ اس جنگ میں فتح کا تمغہ جس فریق کو بھی ملے، عام انسان کی مصیبتوں میں بے پناہ اضافہ ہو جائے گا۔ اور یہ مصیبتیں عالمی ہوں گی، حتیٰ کہ اس کا برا اثر اس ملک تک بھی پہنچ جائے گا جس نے جنگ کے بعد فتح کا تمغہ حاصل کیا ہے۔

جنگ خواہ چھوٹی ہو یا بڑی، وہ مسائل کے حل کے نام پر لڑی جاتی ہے، مگر ہر جنگ صرف مسائل میں اضافہ کرتی ہے۔ ایک مغربی مفکر نے بالکل صحیح کہا کہ مسائل ہمیشہ وہ لوگ پیدا کرتے ہیں جو مسائل حل کرنے کے لیے سرگرم ہوتے ہیں :

Problems are created by problem-solving activity.

جنگوں کی تاریخ میں معلوم طور پر ایک ہی استثنائی نمونہ ہے، اور وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ پیغمبر اسلام کا دوسروں سے ٹکراؤ پیش آیا۔ مگر آپ نے جنگ کا طریقہ اتنا کم استعمال کیا کہ عملاً اور مقابلۃً وہ جنگ نہ کرنے کے برابر ہے۔ اس کے باوجود آپ نے انسانی مسائل کو اتنے کامیاب طور پر حل کیا کہ تاریخ میں اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔

پیغمبر اسلام کے ساتھ وہ تمام احوال پیش آئے جن کے نام پر جنگ کی جاتی ہے۔ مگر آپ نے جنگ کے بجائے امن کی طاقت سے ان کا مقابلہ کیا۔ مسلمان اگر اپنے پیغمبر کی اس سنت کو زندہ کریں، وہ دنیا کو دوبارہ دکھائیں کہ امن کی طاقت کس طرح سب سے بڑی طاقت ہے تو وہ نہ صرف خود اپنی جنگ لڑائی کے بغیر جیت لیں گے، بلکہ اس ربانی طریقہ کا مظاہرہ کر کے وہ قوموں کے امام بن جائیں گے۔

## ۳ فروری ۱۹۹۱

آج کل اخبارات کا پہلا صفحہ خلیج کی جنگ کی خبروں سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مزید خصوصی صفحات صرف اسی جنگ کے بارہ میں ہوتے ہیں جن کے اوپر جلی حرفوں میں لکھا ہوا ہوتا ہے: خلیجی جنگ (The Gulf War) ہندستان ٹائمس (۳ فروری) کا صفحہ ۱۴ اسی قسم کا ایک صفحہ ہے۔ اس میں حسب معمول خلیج کی جنگ سے متعلق خبریں شائع ہوئی ہیں۔

جنگ کی ہلاکت کی خبروں کے درمیان ایک بلا عنوان خبر چار سطروں میں ہے۔ وہ یہ ہے —— ایک شخص جس پر الزام تھا کہ اس نے ۱۹۸۸ سے اب تک نیویارک کے راشسٹر علاقہ کی ۱۰ عورتوں کو قتل کیا ہے، اس کو عدالت نے ۲۵۰ سال قید کی سزا دی ہے جو امریکی قانون میں ایسے مجرم کی کم سے کم سزا ہے:

A man convicted of killing ten Rochester area women in New York since 1988 has been sentenced to a minimum of 250 years in prison.

اخباری ترتیب میں بظاہر یہ سب سے چھوٹی خبر ہے۔ شاید ہی کسی پڑھنے والے نے اس خبر کو پڑھا ہو۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے وہ بلاشبہ سب سے بڑی خبر ہے۔ مہلک جرائم کی سزا جو ملکی قوانین میں مقرر کی گئی ہے، وہ گویا انسانی ضمیر کی آواز ہے۔ یہ سزائیں دراصل انسانی ضمیر کا قانونی اظہار ہیں۔

انسانی ضمیر یہ چاہتا ہے کہ قتل کرنے والے کو قتل کیا جائے۔ یا کم از کم لمبی مدت تک کے لیے اس کو پُرمشقت قید خانہ میں ڈال دیا جائے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انسانی ضمیر کے مطابق، ان لوگوں کی سزا کتنی زیادہ سخت ہونی چاہیے جو ایسی جنگ برپا کرتے ہیں جس میں لاکھوں افراد ہلاک ہوں۔ کروروں انسان زخمی اور اپاہج ہو جائیں۔ زندگی کے قیمتی وسائل بے حساب مقدار میں برباد ہوں۔ خشکی اور سمندر اور فضا سب فساد سے بھر جائیں۔ جن قدرتی ذرائع کو خدا نے انسانیت کی تعمیر کے لیے پیدا کیا ہے، ان کو انسانیت کی تخریب میں ضائع کر دیا جائے۔ مذکورہ قاتل مزید ۲۵۰ سال تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ گویا انسانی عدالت ایک انفرادی مجرم کو بھی سزا دینے کی طاقت نہیں رکھتی۔ پھر جو لوگ ساری انسانی نسل پر ہلاکت کا عذاب انڈیل دیں، ان کو سزا دینا کس کے اختیار میں ہے۔ یہ صورت حال تقاضا کرتی ہے کہ موجودہ محدود دنیا کے بجائے ایک اور لامحدود دنیا ظہور میں آئے۔ لامحدود دنیا میں قائم ہونے والی عدالت ہی کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ ایسے سرکش انسانوں کو بھرپور سزا دے سکے۔

# ۴ فروری ۱۹۹۱

خلیج کی جنگ ۱۷ جنوری کو شروع ہوئی۔ اس وقت سے رات دن مسلسل بم باری کا سلسلہ جاری ہے۔ مگر دو ہفتہ تک سارا معاملہ تقریباً ایک طرفہ رہا۔ اتحادی جہاز عراق کے اوپر آگ برساتے رہے اور صدام حسین اور ان کی فوج زمین دوز بنکروں کے نیچے بیٹھی رہی۔

۳۰ جنوری کو اس میں تبدیلی آئی۔ عراق کی زمینی فوج نے اچانک پیش قدمی کر کے سعودی عرب کی سرحدی بستی الخفجی پر قبضہ کر لیا۔ اس کے فوراً بعد اتحادیوں کی زمینی اور ہوائی فوج متحرک ہوئی۔ دو دن تک "گھمسان کی لڑائی" کی خبریں آتی رہیں۔ آخر عراقی فوج کو بری طرح شکست ہوئی۔ بڑی تعداد میں عراقی ہلاک ہوئے۔ کچھ گرفتار ہوئے اور کچھ اپنا سامان چھوڑ کر بھاگے۔

جنگ کے ایک ماہر نے کہا ہے کہ الخفجی کی جنگ عراقیوں کے لیے الٹی پڑے گی۔ اس سے پہلے امریکہ اور اس کے ساتھی عراق کی زمینی فوج سے ڈرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ زمینی جنگ میں عراق کو زیر کرنا بہت مشکل ہوگا۔ مگر الخفجی کے تجربہ نے انھیں عراقی فوج کی کمزوریوں (weaknesses) کو بتا دیا۔ اس جزئی جنگ میں اتحادیوں نے پایا کہ عراقی فوج کا کمیونی کیشن کا نظام بہت کمزور تھا۔ اسی طرح عراقی فوجیوں میں مہارت (skill) کی بھی بہت کمی نظر آئی۔ مزید یہ کہ انھوں نے محسوس کیا کہ عراقی فوجی دل سے لڑنے پر تیار نہیں ہیں۔ عراقی فوجی لڑائی میں اتنے سخت نہیں تھے جتنا کہ خیال تھا کہ وہ ہوں گے :

...they were not as tough as we thought they might be

تازہ رپورٹ کے مطابق، الخفجی کے بعد امریکی فوج کے حوصلے بہت بلند ہو گئے ہیں اور اب وہ منصوبہ بنا رہے ہیں کہ پوری طاقت کے ساتھ کویت اور عراق پر حملہ کر کے کم سے کم مدت میں عراقی فوج کو تباہ کر دیں۔

الخفجی کے واقعہ نے عراقی فوج کا بھرم ختم کر دیا۔ اب تقریباً یقینی نظر آرہا ہے کہ عراقی فوج امریکہ اور اس کے اتحادیوں کا مقابلہ زمینی جنگ میں نہیں کر پائے گی اور رسواکن شکست سے دوچار ہوگی۔

خواہ دو آدمیوں کا معاملہ ہو یا دو قوموں کا معاملہ، دھاک کی بے حد اہمیت ہوتی ہے۔ آدمی اگر لڑ کر جیتنے والا نہ ہو تو اس کو چاہیے کہ وہ خاموش بیٹھا رہے۔ نہ لڑنے سے کم از کم یہ ہوتا ہے کہ وہ فریق ثانی کے اوپر اپنی دھاک قائم رکھتا ہے، جب کہ جنگ چھیڑنے کی صورت میں وہ جنگ بھی ہار جاتا ہے اور اسی کے ساتھ دشمن کی نظر میں وہ اپنی دھاک بھی کھو دیتا ہے۔

## ۵ فروری ۱۹۹۱

ریاض کے مشہور عربی ہفت روزہ الدعوۃ (۲۲ رجب ۱۴۱۱ھ) میں خلیج کی جنگ کے بارہ میں ایک مضمون چھپا ہے۔ اس کا عنوان ہے: الحماقۃ سلاح ایضا (بیوقوفی بھی ایک ہتھیار ہے)

اس مضمون میں بتایا گیا ہے کہ مغرب کے فوجی افسروں میں سے ایک سے پوچھا گیا کہ اتحادی طاقتوں کے ہاتھ میں سب سے بڑا ہتھیار کیا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ اتحادی طاقتوں کے ہاتھ میں سب سے بڑا ہتھیار صدام حسین کی بے وقوفی اور اس کا طیش اور جنون ہے۔ اور انھیں چاہیے کہ وہ اِس ہتھیار سے فائدہ اٹھائیں تاکہ وہ جلد فتح حاصل کر سکیں:

سُئل احد القادۃ العسکریین الغربیین عن ابرز الاسلحۃ واشدھا فتکا فی ید القوات الدولیۃ المتحالفۃ۔ فقال ان ابرز سلاح فی ایدی القوات المتحالفۃ ھو غباء صدام وطیشہ وجنونہ وان علیھم ان یستثمروا ھذا السلاح لیتمکنوا من تحقیق نصر سریع (صفحہ ۱۰)

اس پر میں یہ اضافہ کروں گا کہ کوئی بھی شخص بے وقوف نہیں ہوتا۔ مشہور قول کے مطابق، کسی چیز کے لیے بڑھی ہوئی محبت آدمی کو اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے (حبك الشيء يعمي ويصم) صدام حسین کی اصل کمزوری ان کا جنون عظمت ہے۔ اپنے آپ کو بڑا دیکھنے کے شوق نے ان کو مجنون بنا دیا۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ ایسے اقدامات کر ڈالتے ہیں جو ان کی واقعی طاقت سے باہر ہوتے ہیں۔

۱۹۷۹ میں عراق کے اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد وہ مسلسل اسی قسم کی احمقانہ کارروائیاں کرتے رہے ہیں۔ ستمبر ۱۹۸۰ میں انھوں نے الجزائر معاہدہ (۱۹۷۵) کو یک طرفہ طور پر منسوخ کر کے ایران پر حملہ کر دیا اور آٹھ سال تک بے فائدہ اس سے لڑتے رہے۔ اسی طرح ۲ اگست ۱۹۹۰ کو انھوں نے اچانک کویت پر حملہ کر کے اپنے آپ کو اتنی بڑی مشکل میں پھنسا لیا جس سے نپٹنے کی طاقت ان کے اندر نہیں۔

ایمان آدمی کے اندر تواضع پیدا کرتا ہے، اور جس آدمی کے اندر تواضع کی صفت پیدا ہو جائے وہ ہر قسم کی حماقتوں سے بچ جائے گا۔ وہ ایسی طاقت بن جائے گا کہ بڑے سے بڑا دشمن بھی اس کو زیر نہ کر سکے۔

حماقت اکثر حالات میں اپنے آپ کو بڑا سمجھ لینے کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے۔ ایمان آدمی کو بڑائی کے جذبہ سے بچا لیتا ہے، اس لیے ایمان آدمی کو احمقانہ کارروائی سے بھی بچا لیتا ہے۔

۶ فروری ۱۹۹۱

**مزائل** (missile) سب سے پہلے جرمنوں نے دوسری عالمی جنگ میں استعمال کیا تھا۔ اس کے بعد روس اور امریکہ وغیرہ نے اس کو مزید ترقی دے کر خطرناک قسم کے دور مار ہتھیار کی حیثیت دے دی۔ یہ ایک پیچیدہ مشین ہے جس کے سرے پر دھماکہ خیز چیزیں نصب ہوتی ہیں۔ اس کو لانچر کے ذریعہ دور کے نشانہ پر پھینکا جاتا ہے۔ اس کی رفتار ریڈیو کی لہروں کے ذریعہ کنٹرول ہوتی ہے۔ وہ نہایت تیز پٹاخہ کی طرح فضا میں اڑتے ہوئے مطلوبہ نشانہ پر جا کر گرتا ہے۔

جرمن ٹکنالوجی کو مزید ترقی دے کر روسیوں نے ایک خطرناک مزائل بنایا جس کو اسکڈ (Scud) کہا جاتا ہے۔ یہ اسکڈ مزائل عراق نے بڑی تعداد میں سوویت روس سے خرید کر حاصل کیے اور ان کو مزید ترقی دے کر اس قابل بنایا کہ ان کو دور کے نشانوں پر مارا جا سکے۔

عراق کے صدر صدام حسین کو اپنے اسکڈ مزائل پر بہت اعتماد تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اسکڈ کی صورت میں ان کے پاس ایسا ہتھیار ہے کہ وہ حیران کن طور پر اپنے دشمنوں پر ضرب لگا سکتے ہیں۔ خلیج کی جنگ کے دوران انھوں نے ان کو مسلسل استعمال کیا۔ تقریباً ڈیڑھ درجن اسکڈ مزائل انھوں نے اسرائیل کے شہروں (حیفہ اور تل ابیب) پر پھینکے۔ اتنے ہی اسکڈ انھوں نے سعودی عرب (ظہران اور ریاض) نیز بحرین پر پھینکے۔ مگر عملاً ان کے اسکڈ مزائل غیر موثر ہو کر رہ گئے۔ کیوں کہ امریکی "پیٹریٹ" نے ان کو نشانہ پر پہنچنے سے پہلے مار کر گرا دیا۔

اس کا قصہ یہ ہے کہ روس نے جب اسکڈ مزائل بنائے تو امریکہ نے بھی ریسرچ شروع کر دی کہ اس کا توڑ کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ امریکہ نے ایک جوابی مزائل تیار کیا جس کو پیٹریٹ مزائل کہا جاتا ہے۔ پیٹریٹ



مزائل میں یہ صلاحیت تھی کہ جس وقت اسکڈ اپنے لانچر سے نکل کر روانہ ہو، عین اسی وقت پیٹریٹ بھی اڑ کر تیزی سے اس کی طرف روانہ ہو، اور اسکڈ سے ٹکرا کر درمیان ہی میں اس کو ناکارہ کر دے۔ چنانچہ خلیج کی جنگ کے دوران عراق نے کئی درجن اسکڈ مزائل استعمال کیے۔ مگر امریکی پیٹریٹ ہر بار فضا میں پہنچ کر درمیان ہی میں اس سے ٹکرا گیا اور نشانہ پر پہنچنے سے پہلے اس کو ناکارہ بنا دیا۔

نیچے کی تصویر میں دونوں مزائلوں کو عمل کرتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک طرف عراق سے اسکڈ مزائل روانہ ہوتا ہے۔ دوسری طرف عین اسی وقت اسرائیل کے امریکی فوجی اڈہ سے پیٹریٹ مزائل اڑتا ہے اور وہ راستہ میں اسکڈ مزائل سے ٹکرا کر درمیان ہی میں اس کو برباد کر دیتا ہے۔

پیٹریٹ مزائل کے اس عمل میں مصنوعی سیارہ سے لے کر زمینی کنٹرول اسٹیشن تک نہایت پیچیدہ نظام شامل رہتا ہے۔ تاہم پیٹریٹ کی کامیابی کا خاص راز اسکڈ مزائل کی ایک کمزوری ہے۔ اسکڈ کی خود اپنی ایک کمزوری نے امریکہ کو موقع دیا کہ وہ اس کا کامیاب توڑ تیار کر سکے۔

اسکڈ جب تیزی کے ساتھ فضا میں گزرتا ہے تو وہ نہایت سخت قسم کی گرمی پیدا کرتا ہے۔ یہ گرمی اسکڈ کی کمزوری ہے۔ پیٹریٹ فضا میں اٹھ کر اسی گرمی کا پیچھا کرتا ہے۔ پیٹریٹ میں ایسا مادہ ہوتا ہے جو گرمی کی طرف کھنچے۔ چنانچہ وہ گرمی کی رہنمائی میں اسکڈ تک پہنچ جاتا ہے اور اس سے ٹکرا کر اس کو درمیان ہی میں برباد کر دیتا ہے۔

اس دنیا میں ہر چیز کی ایک کمزوری ہے۔ ہر چیز خود اپنے ساتھ اپنا ایک توڑ لیے ہوئے ہے۔ اگر آپ اس توڑ کو جان لیں تو ہر چیز کا مقابلہ نہایت کامیابی کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ ہر مخالف چیز کو خود اسی کے ہتھیار کی مدد سے شکست دے سکتے ہیں۔



۷ فروری ۱۹۹۱

روزنامہ ہندستان ٹائمس (۶ فروری) میں سعودی عرب کے سابق آئل منسٹر احمد ذکی یمانی کا ایک بیان پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ خلیج کی جنگ تیل کی وجہ سے ہے۔ انھوں نے سویڈش روزنامہ (Svenska Dagbladet) کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ مستقبل میں جس کے ہاتھ میں تیل کے ذرائع ہوں گے، وہی دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہوگی :

> ...in future the power which will have oil resources in its hands will be the superpower of the world.

انھوں نے کہا کہ خلیج فارس چونکہ تیل کے عالمی ذخیرہ کا ۷۵ فی صد حصہ رکھتا ہے، خلیج میں امریکی غلبہ کا مطلب یہ ہوگا کہ امریکہ اس کے ذریعہ اس قابل ہو جائے گا کہ وہ مستقبل کے بین اقوامی حالات میں تیل کو ایٹم بم کے بدل کے طور پر استعمال کر سکے :

> ...because the Persian Gulf has 75 per cent of the entire resources of the world, a U.S. domination of Gulf oil would mean it would be able to use as an alternative to atomic bomb in future international developments (p. 12).

مزید یہ کہ آج ہی کے اخبار میں امریکی صدر مسٹر جارج بش کا ایک بیان چھپا ہے۔ انھوں نے واشنگٹن میں کہا کہ خلیج کی جنگ امریکہ کی آخری جنگ ہوگی۔ اس کے بعد نئے عالمی نظام کی وجہ سے کوئی اور جنگ لڑنے کی ضرورت نہ رہے گی :

> ...the Gulf war would be America's last war. There would be no need to fight another one because of the new world order (p. 12).

دور اول میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو سیاسی اقتدار دیا۔ اس کے ذریعہ وہ ساری دنیا میں اسلام کا دبدبہ قائم کرنے میں کامیاب رہے۔ موجودہ زمانہ میں دوبارہ اللہ کی مدد سے مسلم دنیا کے نیچے تیل کا قدرتی خزانہ نکل آیا جو صنعتی دور میں سپر پاور بنانے کا ذریعہ ہے۔ مگر آج یہ حالت ہے کہ ان کے اثاثہ کے ذریعہ دوسری قوم عالمی سپر پاور بن رہی ہے اور خود مسلمانوں کے حصہ میں مغلوبیت کے سوا اور کچھ نہیں۔

خارجی مواقع کو استعمال کرنے کے لیے داخلی طاقت درکار ہے، داخلی کمزوری کے ساتھ خارجی مواقع کو استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ داخلی طاقت کے بغیر خارجی مواقع کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ایک شخص کا جسم ہو مگر اس سے اس کی روح نکل گئی ہو۔

## ۸ فروری ۱۹۹۱

قومی آواز (۸ فروری) اور دوسرے اخبارات میں یہ رپورٹ چھپی ہے کہ پاکستان کی سیاست اس وقت بحران میں مبتلا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان کی حکومت خلیج کے مسئلہ میں سعودی عرب اور امریکہ کے ساتھ ہے مگر وہاں کے عوام پر جوش طور پر صدام حسین کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ اسلامی جمہوری اتحاد کے وزیر اعظم نواز شریف نے ۵ جنوری کو سارے ملک میں یوم کشمیر منایا۔ اس کا مقصد خلیجی مسئلہ سے عوام کی توجہ کو ہٹانا تھا۔ مگر حکومتی سطح پر اس کو کامیاب کرنے کی ساری کوششوں کے باوجود یوم کشمیر کامیاب نہ ہو سکا۔

یہی صورت حال زیادہ بڑے پیمانہ پر عرب دنیا کی ہے۔ وہاں واضح طور پر مسلمان دو حصوں میں بٹ گئے ہیں۔ خواص کا ایک طبقہ سعودی عرب اور امریکہ کے ساتھ ہے۔ مگر عوام بالکل طوفانی انداز میں صدام حسین کی حمایت کر رہے ہیں۔ یہ صورت حال موجودہ زمانہ کی مسلم قیادت کی ایک بہت بڑی کمزوری کو بتاتی ہے۔ اور وہ ہے: سیاست کو حقیقت پسندانہ بنیاد پر چلانے کے بجائے جذباتی بنیادوں پر چلانا۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد فلسطین کا جو مسئلہ پیدا ہوا وہ بلاشبہ ایک سنگین مسئلہ تھا، اس معاملہ میں صحیح طریقہ یہ تھا کہ قول اور عمل میں تناسب کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی مہم چلائی جاتی۔ مگر مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے لوگوں نے یہ کیا کہ عملی امکانات کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ بڑے بڑے الفاظ بولتے رہے۔ پچھلے پچاس برس میں ان کا حال یہ رہا کہ تقریر اور تحریر کے ہر موقع پر "قبلہ اول" کے معاملہ میں لوگوں کو جذباتیت کی خوراک دیتے رہے۔ یہاں تک کہ مشرق سے مغرب تک تمام مسلم عوام فلسطین کے مسئلہ میں آخری حد تک جذباتی ہو گئے۔

موجودہ مسلمان اسی قسم کی لفظی جذباتیت پر بنی ہوئی قوم تھے۔ صدام حسین نے اسی کا فائدہ اٹھایا۔ انھوں نے امریکہ اور اس کے اتحادیوں سے کہا کہ "تم فلسطین کو یہودیوں سے خالی کراؤ، اس کے بعد ہم بھی کویت سے اپنی فوجیں واپس بلالیں گے"۔ صدام حسین کا یہ بیان محض ایک خوش نما نعرہ تھا، مگر مسلمان، جن کو پہلے ہی نعرہ پسند بنایا جا چکا تھا، وہ عین اپنے مزاج کے تحت اس لفظی نعرہ کی طرف دوڑ پڑے۔

سیاست کا تعمیری طریقہ یہ ہے کہ کسی معاملہ میں عوام کو ضرورت سے زیادہ حساس نہ بنایا جائے۔ جب بھی ایسا کیا جائے گا تو یہی ہوگا کہ عوام سنجیدہ معاملہ کی اہمیت کو نہیں سمجھیں گے اور جس چیز میں انھیں مبالغہ آمیز حساسیت میں مبتلا کیا گیا ہے اس کی طرف ہجوم کر کے دوڑ پڑیں گے۔

## ۹ فروری ۱۹۹۱

دکتور عبد الرحمٰن العوضی کویت کی حکومت کے ایک وزیر ہیں۔ وہ امیر کویت کے خصوصی نمائندہ کے طور پر نئی دہلی آئے۔ یہاں انھوں نے حکومت ہند کے ذمہ داروں سے ملاقات کی۔ ۸ فروری ۱۹۹۱ کو انھوں نے نئی دہلی میں ایک پریس کانفرنس کی۔ اس کی تفصیلات آج کے اخباروں میں شائع ہوئی ہیں۔

دکتور العوضی نے اس کا اعتراف کیا کہ اس وقت مسلم دنیا میں صدام نوازی کا طوفان آیا ہوا ہے اور امریکہ کو ظالم قرار دے کر اس کی مذمت کی جا رہی ہے۔ مگر اس کی وجہ سوچ کا فرق ہے۔ انھوں نے کہا کہ خلیج کی جنگ ۱۷ جنوری ۱۹۹۱ کو شروع نہیں ہوئی۔ بلکہ وہ ۲ اگست ۱۹۹۰ سے ہی شروع ہو چکی تھی جب کہ عراق نے جارحیت کر کے کویت پر فوجی قبضہ کر لیا (قومی آواز، ۹ فروری ۱۹۹۱)

کویتی وزیر کے اس بیان کا مطلب یہ ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ جنگ کا آغاز صدام حسین نے ۲ اگست ۱۹۹۰ کو کیا، اس لیے ہم کو صدام حسین جارح نظر آتے ہیں۔ مسلم عوام یہ سمجھ رہے ہیں کہ جنگ کا آغاز امریکہ نے ۱۷ جنوری ۱۹۹۱ کو کیا۔ اس لیے انھیں نظر آتا ہے کہ اس معاملہ میں زیادتی امریکہ کی طرف ہے۔

اس کو میں نے پڑھا تو میں نے سوچا کہ یہ صرف خلیج کی موجودہ لڑائی کی بات نہیں ہے، یہی تمام نزاعات کی بات ہے۔ جو لوگ نزاع کے آغاز کو "۲ اگست" سے شمار کرتے ہیں وہ ایک فریق کو ذمہ دار بتاتے ہیں، اور جو لوگ نزاع کا آغاز "۱۷ جنوری" سے کرتے ہیں ان کے نزدیک ساری ذمہ داری دوسرے فریق کے خانہ میں چلی جاتی ہے۔

نزاع کی ہر کہانی میں پہلے عمل ہوتا ہے، اور اس کے بعد اس کا ردعمل۔ اس طرح اس کا ایک نصف اول ہوتا ہے، اور دوسرا اس کا نصف ثانی۔ بیشتر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ اس طرح کے معاملہ میں پوری کہانی کو نہیں بتاتے۔ ہر آدمی اس حصہ کو لے لیتا ہے جو اس کے موافق ہو۔ کوئی حصۂ اول کو نمایاں کرتا ہے، اور کوئی حصۂ ثانی کو۔

جب بھی دو فریقوں میں کوئی ٹکراؤ یا فساد پیدا ہوتا ہے تو اس واقعہ کا ایک "۲ اگست" ہوتا ہے اور ایک اس کا "۱۷ جنوری"۔ جو لوگ واقعہ کو ۲ اگست کے اعتبار سے دیکھتے ہیں ان کو ایک فریق غلطی پر نظر آتا ہے، اور جو لوگ واقعہ کو ۱۷ جنوری کے اعتبار سے دیکھتے ہیں ان کو دوسرا فریق غلطی پر دکھائی دیتا ہے۔ تاہم اسلامی نقطۂ نظر سے "۲ اگست" والا فریق ہی غلط ہے، کیونکہ: البادیٔ اظلم (آغاز کرنے والا زیادہ ظالم ہے)

## ۱۰ فروری ۱۹۹۱

پاکستان کے وزیر اعظم میاں نواز شریف نے امن مشن کے تحت چھ مسلم ملکوں کا دورہ کیا۔ جنوری ۱۹۹۱ کے آخری ہفتہ میں وہ ایران، ترکی، شام، اردن، مصر اور سعودی عرب گئے۔ ہر جگہ وہ حکومت کے سربراہوں سے ملے اور خلیج کی جنگ کو روکنے کے لیے بات چیت کی۔ ہندستان ٹائمس (۱۰ فروری) کی ایک خبر سے معلوم ہوا کہ وہ اپنے "گلف پیس مشن" کے تحت دوسرے دورہ پر روانہ ہوئے ہیں۔ اس دورہ میں وہ الجیریا، مراکو، تیونس اور لیبیا جائیں گے۔ اس سلسلہ میں وہ اسلام آباد میں عراقی سفیر اسماعیل حمودی حسین سے بھی کئی بار مل چکے ہیں۔ اردن کے شاہ حسین کے ذریعہ انھوں نے اپنا پیغام صدام حسین تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔

پاکستانی روزنامہ نوائے وقت (۲ فروری ۱۹۹۱) کے صفحہ اول کی ایک خبر میں بتایا گیا ہے کہ مسٹر نواز شریف نے اسلام آباد میں وزیر اعظم سکرٹریٹ میں ملک کی سیاسی و مذہبی جماعتوں کے قائدین اور دوسرے ممتاز سیاست دانوں سے خلیج کی صورت حال پر گفتگو کی اور اپنے "امن مشن" کی تفصیلات سے انھیں آگاہ کیا۔ "وزیر اعظم نواز شریف نے کہا کہ ہم نے صدر صدام حسین سے صرف تین لفظوں کا مطالبہ کیا ہے کہ وہ ایک مرتبہ یہ کہہ دیں کہ آئی ول ود ڈرا (I will withdraw) تو پھر باقی کام آسان ہو جائے گا"۔ یعنی میں کویت سے اپنی فوج واپس بلا لوں گا۔

مسٹر نواز شریف کا یہ بیان صرف ان کی سادہ لوحی کا ثبوت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مذکورہ تین لفظ (آئی ول ود ڈرا) کی بات نہیں، بلکہ ایک اور تین لفظ آئی واز رانگ (I was wrong) کی بات ہے۔ اور یہ دوسرا تین لفظ ایسا ہے جس کو کہنے والا آج کی دنیا میں کوئی نہیں، حتی کہ خود پاکستان کے اسلام پسند لیڈر بھی نہیں۔

"میں نے غلطی کی" کہنا کوئی سادہ سی بات نہیں۔ یہ در اصل اپنے آپ کو رد کرنا ہے۔ یہ خود اپنی زبان سے اپنی نفی کرنے کے ہم معنی ہے۔ یہ جملہ کہنے کے لیے بہت بڑا حوصلہ درکار ہے۔ چونکہ لوگوں میں اتنا بڑا حوصلہ نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ اس جملہ کو اپنی زبان سے دہرانے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتے۔

آدمی جب ایک بات بول دے یا وہ ایک اقدام کر بیٹھے تو اس کے بعد وہ اس کو اپنے لیے وقار کا مسئلہ بنا لیتا ہے۔ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ اگر میں نے اپنے کو غلط کہا یا اپنے اقدام کو واپس لیا تو لوگوں کی نظر میں بے قیمت ہو جاؤں گا۔ یہ اندیشہ اس کو اعتراف سے روک دیتا ہے۔ اپنے خیالی وقار کو بچانے کے لیے وہ اپنے پورے وجود کو اور بعض اوقات پوری قوم کو تباہی کے گڑھے میں گرا دیتا ہے۔

۱۱ فروری ۱۹۹۱

عراق کے حکمراں صدام حسین نے ۱۹۸۰ میں اپنی فوجیں ایران کے اندر داخل کر دیں۔ اس وقت ان کا نعرہ تھا کہ الطریق الی القدس یمرّ بطهران (قُدس کا راستہ تہران سے گزرتا ہے) مگر آٹھ سال کی باہمی لڑائی کے بعد ۱۹۸۸ میں دونوں کے درمیان جنگ بندی ہوئی تو حال یہ تھا کہ قُدس پر یہودیوں کا قبضہ بدستور باقی تھا۔ البتہ دو مسلم ملکوں کی آپس کی جنگ میں دونوں طرف کے لاکھوں آدمی مارے گئے اور کھربوں روپے کی دولت ضائع ہوگئی۔

صدام حسین نے دوسری بار اگست ۱۹۹۰ میں کویت پر حملہ کر دیا۔ کویت ایک بے حد چھوٹا ملک تھا، وہ اپنا بچاؤ نہ کر سکا۔ چنانچہ عراق کی فوجیں اس پر قبضہ کر کے بیٹھ گئیں۔ اس جارحانہ اقدام کے متعلق بھی دوبارہ صدام حسین کا نعرہ ہے کہ الطریق الی القدس یمرّ بالکویت (قُدس کا راستہ کویت سے گزرتا ہے)

دونوں بار مسلم دنیا کے بہت سے لوگ اس نعرہ کے فریب میں آگئے۔ انھوں نے صدام حسین کی حمایت کرنا شروع کر دیا۔ انھوں نے یقین کر لیا کہ صدام حسین تہران اور کویت سے ہو کر یروشلم میں داخل ہونا چاہتا ہے تاکہ قُدس (بیت المقدس) کو آزاد کرائے۔ ان مسلمانوں میں سے کسی نے یہ نہ سوچا کہ صدام حسین کو اگر یروشلم پر قبضہ کرنا تھا تو ان کو بغداد سے سیدھے یروشلم کی طرف مارچ کرنا چاہیے تھا، انھوں نے اس مقصد کے لیے یہ ٹیڑھا راستہ کیوں اختیار کیا کہ پہلے تہران اور کویت پر قبضہ کرو، اس کے بعد یروشلم کی طرف اقدام کرو۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ ان کی بے شعوری ہے جس کی وجہ سے وہ جھوٹے نعروں کے پیچھے دوڑ پڑتے ہیں۔ اگر مسلمان ایک باشعور قوم ہوتے تو وہ صدام حسین کے جارحانہ اقدام کی کبھی حمایت نہ کرتے۔ مگر مسلمانوں کی بے شعوری کی وجہ سے صدام حسین کو مسلم دنیا میں اپنے بہت سے حامی مل گئے۔

اسی بے شعوری کی بنا پر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ صرف الفاظ کو جانتے ہیں، معانی کی انھیں خبر نہیں۔ وہ باتوں کو صرف ظاہری سطح پر دیکھتے ہیں، وہ باتوں کو اندرونی سطح پر دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ وہ اپنے جذبات سے واقف ہیں مگر خارجی دنیا کے حقائق کا انھیں پتہ نہیں۔ وہ سچے اقدام اور جھوٹے اقدام کا فرق نہیں جانتے۔ اور جو لوگ سچے اقدام اور جھوٹے اقدام کا فرق نہ جانیں، ان کو کوئی بھی چیز بربادی کی چھلانگ سے بچانے والی نہیں۔

اس دنیا میں "فرق" کو جاننا سب سے بڑی دانائی ہے۔ اور فرق کو نہ جاننا سب سے بڑی نادانی۔

## ۱۲ فروری ۱۹۹۱

" المجلۃ " ایک عربی ہفت روزہ ہے۔ وہ جدہ میں چھپتا ہے اور لندن سے شائع کیا جاتا ہے۔ اس کے شمارہ ۱۲ فروری ۱۹۹۱ میں کویت کے ایک وزیر الدکتور عبد الرحمٰن العوضی کا انٹرویو شائع ہوا ہے۔ اس انٹرویو کے سوالات وجوابات کا تعلق خلیج کی موجودہ صورت حال سے ہے۔

المجلہ کے نمائندہ نے دکتور العوضی سے پوچھا کہ آئندہ کویت کا مستقبل داخلی اعتبار سے کیا ہوگا (کیف سیکون مستقبل الکویت داخلیا) دکتور العوضی نے اس کا جو جواب دیا، اس کا ایک جزء یہ تھا کہ ہمیں چاہیے کہ ہم ماضی کے تجربہ سے سبق سیکھیں اور اس سے فائدہ اٹھائیں۔ اور شاید سب سے بڑی غلطی جس میں ہم مبتلا ہوئے، وہ یہ تھی کہ ہم نے ایسے شخص کے اوپر اعتماد کیا جو اس کا مستحق نہ تھا (ینبغی أن نتعلم من دروسنا السابقۃ ونستفید منھا۔ ولعلّ اھمّ خطأ وقعنا فیہ ھو وضع ثقتنا فی من لا یستحقھا) صفحہ ۲۷

کویت نے عراقی صدر کو اپنا عرب بھائی سمجھ کر ان کے اوپر اعتماد کیا اور بلینوں ڈالر کے ذریعہ ان کی مدد کی۔ مگر عراقی صدر نے اپنے آپ کو طاقتور بنا کر خود اپنے محسن کے اوپر حملہ کر دیا۔ چنانچہ اب کویت کے ذمہ دار اعلان کر رہے ہیں عراقی صدر بھروسہ قابل نہیں۔

مگر عجیب بات ہے کہ عین اسی وقت ساری دنیا کے مسلمانوں نے عراقی صدر کی تقریروں سے متاثر ہو کر دوبارہ ان کے اوپر سب سے زیادہ بھروسہ کر لیا ہے۔ وہ ان کو اپنا حمایتی اور اپنا نجات دہندہ سمجھ رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں مسلم عوام حال میں وہی غلطی کر رہے ہیں جو کویتی حکمرانوں نے ماضی میں کی۔ دونوں نے عراقی صدر کی باتوں کی بنیاد پر ان کے بارہ میں اپنی رائے قائم کی۔ حالانکہ اصل قابل لحاظ چیز کردار ہے نہ کہ بات۔ امام مالک نے قاسم بن محمد تابعی کے بارہ میں نقل کیا ہے کہ وہ کہا کرتے تھے :

| | |
|---|---|
| ادرکتُ الناسَ وما یَعجَبُون بالقولِ۔ اِنما یُنظرُ اِلی عملہِ ولا یُنظرُ اِلی قولہِ (موطا، صفحہ ۷۰۲) | میں نے ایسے لوگ (صحابہ) دیکھے ہیں جو قول کو کچھ بھی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ دراصل آدمی کا عمل دیکھا جائے گا، اس کا قول نہیں دیکھا جائے گا۔ |

کتنا زیادہ فرق ہے صحابہ کی سوچ میں اور موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی سوچ میں۔

## ۱۳ فروری ۱۹۹۱

نوائے وقت (۱۳ فروری) میں ملک امجد حسین ایڈوکیٹ کا مضمون چھپا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ خلیج کی جنگ نے پاکستانی عوام کو جذبات کی رو میں بہادیا۔ وہ حقائق کو ملحوظ رکھ کر فیصلہ نہیں کر رہے ہیں۔ ان کے نزدیک صدام حسین اسلام کے ہیرو ہیں اور انھوں نے فلسطین کے مسئلہ کو زندہ کیا ہے۔ کویت پر قبضہ کے سلسلہ میں ان کا کہنا ہے کہ کویت تو عراق ہی کا حصہ تھا۔ اس کو ۱۹۱۸ میں انگریز نے اس سے علیحدہ کر کے ایک آزاد اور خود مختار ریاست کا درجہ دے دیا۔

مضمون نگار کے جواب کا ایک پیراگراف یہ ہے: اگر بالفرض یہ تسلیم کر لیا جائے کہ انگریز نے اپنی مصلحت کے تحت ۱۹۱۸ میں کویت کو عراق سے علیحدہ کر کے ایک آزاد اور خود مختار ریاست میں تبدیل کیا تب بھی ایسا کہنا حقیقت کا تقاضا نہیں۔ اس طرح تو پاکستان بھی ۴۴ سال پہلے ہندستان کا حصہ تھا۔ اور بھارت والے یہ موقف اختیار کر سکتے ہیں کہ انگریز نے اپنے مفاد کے لیے اس کو ہندستان سے کاٹ کر ایک علیحدہ ریاست بنا دیا، یہ کہہ کر وہ زبردستی پاکستان پر قبضہ کر لیں۔ ایسا خیال تاریخی اور واقعاتی طور پر درست نہیں۔ (صفحہ ۲)

اسی کا نام دہرا منطق ہے، اور دہرا منطق مسلمانوں کا خاص مزاج ہے۔ کویت پر عراقی قبضہ کے لیے وہ جس منطق کو درست سمجھتے ہیں، اسی منطق کو پاکستان پر ہندستانی یا فلسطین پر یہودی قبضہ کے لیے درست ماننے پر تیار نہیں۔

لکھنؤ کے عربی پرچہ الرائد (یکم فروری ۱۹۹۱) نے محمد وجدی قندیل کا ایک مضمون نقل کیا ہے۔ اس کا عنوان ہے ــــ خلیجی لڑائی کا ذمہ دار کون (من المسئول عن الحرب) مضمون نگار نے خلیج کی جنگ کے تباہ کن نقصانات کا ذکر کیا ہے۔ پھر وہ لکھتے ہیں کہ جنگ کی اس آگ کو بھڑکانے کا ذمہ دار کون ہے، وہ کون ہے جس نے عراق کے اوپر جہنم کے دروازے کھول دیے۔ حقائق بتاتے ہیں کہ یہ صدام حسین ہیں جو اس جنگ کا سبب بنے۔ عراقی لیڈر شپ ہی اس ہیبت ناک المیہ کی ذمہ دار ہے جس کا سامنا عراق کو ہے (القیادۃ العراقیۃ ھی التی تتحمل المسئولیۃ عن الماساۃ الرھیبۃ التی یتعرض لھا العراق) صفحہ ۶

یہ بات اسلامی اصول کے عین مطابق ہے۔ اسلام میں سبب کو دیکھا جاتا ہے نہ کہ نتیجہ کو۔ اس طرح کے معاملات خواہ جہاں بھی ہوں، صاحب سبب کو ذمہ دار ٹھہرایا جائے گا۔

مگر یہ سراسر اسلام کے خلاف ہے کہ آدمی ایک جگہ ایک دلیل استعمال کرے اور دوسری جگہ دوسری دلیل۔ ایک معاملہ میں وہ ایک طریقہ کا حامی ہو اور دوسرے معاملہ میں وہ دوسرے طریقہ کی حمایت کرنے لگے۔

## ۱۴ فروری ۱۹۹۱

لندن سے شائع ہونے والے عربی المجلۃ (۱۳-۱۹ فروری ۱۹۹۱) میں الدکتور تحسین معلا کا انٹرویو چھپا ہے۔ موصوف نے جامعہ بغداد میں میڈیکل تعلیم حاصل کی ہے۔ ایک زمانہ میں وہ صدام حسین کے ذاتی معالج رہ چکے ہیں۔

دکتور معلا نے جنگ کے نتیجہ میں عراق کی تباہی کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ عراقی قوم آج سخت ترین مصیبت میں مبتلا ہے۔ اور یہ بلاشبہ ہر انسان کے لیے تکلیف دہ ہے۔ مگر ان مصیبتوں کا اصل ذمہ دار انھوں نے "اتحادی طاقتوں" کو نہیں قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ اس کی ذمہ داری تمام تر عراقی لیڈرشپ پر ہے۔ عراق صدام حسین کے جرائم کی قیمت ادا کر رہا ہے (العراق یدفع ثمن جرائم صدام حسین) صفحہ ۴۴

اسی طرح ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوۃ (۱۴ فروری ۱۹۹۱) میں اس کے "المحرر السیاسی" کے قلم سے دو صفحہ کا ایک جائزہ چھپا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ موجودہ جنگ کے نتیجہ میں فلسطینیوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے، وہ ان عرب ملکوں سے کٹ گئے جو بلینوں ڈالر کے ذریعہ مسلسل ان کی مدد کر رہے تھے اور اپنے یہاں ان کو عزت کی جگہ دیے ہوئے تھے۔ وہ اس قسم کے تمام فوائد سے محروم ہو گئے۔

اس نقصان اور محرومی کا سبب عرب ممالک یا کوئی اور نہیں ہے بلکہ خود فلسطینیوں کی اپنی قیادت ہے۔ فلسطینی قوم نے بہت مہنگی اور بہت بھاری قیمت ادا کی ہے، اور اس کا سبب بعض فلسطینی لیڈروں کا وہ موقف ہے جو انھوں نے کویت پر قبضہ کے سلسلہ میں صدام حسین کے جرائم کی تائید کر کے اختیار کیا۔ (ان الشعب الفلسطینی دفع الثمن غالیاً و باھظاً بسبب الموقف الذی اتخذتہ بعض القیادات الفلسطینیۃ بتایید اجرام صدام حسین فی احتلالہ لدولۃ الکویت) صفحہ ۸

یہ نہایت صحیح بات ہے۔ مگر اس کا تعلق صرف کویت اور عراق سے نہیں ہے بلکہ ساری دنیا سے ہے۔ ہر جگہ (بشمول ہندستان) آج مسلمانوں کو جن مشکلات اور مصائب کا سامنا ہے، ان سب کی واحد ذمہ داری موجودہ زمانہ کے مسلم لیڈروں پر آتی ہے نہ کہ مفروضہ "اسلام دشمنوں" پر۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلم لیڈروں نے، تقریباً بلا استثناء، مسلمانوں کی نہایت غلط رہنمائی کی۔ وہ ان کو جذباتی نعروں پر دوڑاتے رہے۔ اس کے نتیجہ میں خود ان لیڈروں کو تو شہرت اور مقبولیت حاصل ہو گئی۔ مگر مسلم عوام کے حصہ میں اس کے سوا کچھ نہ آیا کہ ان کی مشکلات میں مزید بے پناہ اضافہ ہو گیا۔

## ۱۵ فروری ۱۹۹۱

آج کی ڈاک سے لاہور کا ماہنامہ آئین (فروری ۱۹۹۱) ملا۔ یہ جماعت اسلامی پاکستان کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ۲۶ جنوری کو جماعت اسلامی پاکستان کی مرکزی مجلس عاملہ کا اجلاس لاہور میں ہوا۔ اس میں خلیج کے مسئلہ سے متعلق ایک قرار داد اتفاق رائے سے منظور کی گئی۔

قرار داد میں کہا گیا ہے کہ امریکہ خلیج کی یہ جنگ اپنے سامراجی مقاصد اور سیاسی عزائم کے لیے کر رہا ہے۔ اس کو فوری طور پر بند ہونا چاہیے۔ اور یہ کہ "یہ پوری دنیا کے مسلمانوں اور امن پسند انسانوں کے دل کی پکار ہے۔ اور امریکہ اور اس کے اتحادیوں اور عراق دونوں کو ضد اور ہٹ دھرمی کی روش ترک کر کے امن کی اس اپیل پر لبیک کہنا چاہیے"

جماعت اسلامی کی یہ اپیل میرے نزدیک کھوکھلے الفاظ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔ کیوں کہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کا یہ ظالمانہ اقدام اپنے ذاتی انٹرسٹ کے تحت ہوا ہے، اور جہاں ذاتی انٹرسٹ کا معاملہ ہو وہاں کوئی بھی اپنی ضد کو چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتا۔ حتی کہ خود مذکورہ اپیل کرنے والے لوگ بھی نہیں۔

اس کی ایک مثال خود پاکستان کا واقعہ ہے۔ پاکستان کے سابق فوجی صدر جنرل ضیاء الحق نے مسٹر بھٹو پر مقدمہ چلا کر عدالت سے پھانسی کا فیصلہ حاصل کیا۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اور جماعت اسلامی نے پوری طرح اس معاملہ میں جنرل ضیاء الحق کی تائید کی۔ جب مسٹر بھٹو کی پھانسی کا اعلان ہوا تو تمام دنیا کے ممالک (بشمول مسلم ممالک) نے اپیل کی کہ بھٹو کو پھانسی نہ دی جائے۔ مگر جماعت اسلامی اور جنرل ضیاء الحق نے اس عمومی اپیل کی پروا نہ کی اور بھٹو کو پھانسی پر چڑھا دیا۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ بھٹو کا زندہ رہنا ان کی اپنی سیاسی موت کے ہم معنی ہوگا۔

آج تمام لوگوں کا یہ حال ہے کہ جہاں ان کا ذاتی انٹرسٹ ہو وہاں وہ کسی کی بات نہیں سنتے۔ ایسے لوگ دوسروں کو کس طرح نصیحت کر سکتے ہیں کہ تم اپنے انٹرسٹ کو نظر انداز کر کے دوسروں کی بات سنو اور اپنے اقدام کو واپس لے لو۔ لوگوں کے پاس دوسروں کے لیے اصول ہے اور اپنے لیے مفاد۔ اس معاملہ میں لوگوں کا حال وہی ہے جو برطانی ادیب ڈبلیو ایس لینڈر (۱۸۶۴ - ۱۷۷۵) نے کہا تھا کہ ہم اصول کی بات کرتے ہیں مگر ہم مفاد پر عمل کرتے ہیں :

We talk on principle, but we act interest.

## ۱۶ فروری ۱۹۹۱

المجلۃ (۱۳-۱۹فروری) میں ایک احتجاجی جلوس (تظاھرۃ) کی تصویر ہے۔ یہ امریکہ میں بسنے والے عراقیوں کا جلوس ہے۔ وہ مختلف تختیاں اٹھائے ہوئے سڑک پر چل رہے ہیں۔ ایک تختی پر لکھا ہوا ہے :

الجالیۃ العراقیۃ غیر مسئولۃ عن جرائم صدام (عراقی مہاجرین صدام کے جرائم کے ذمہ دار نہیں)

رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ممالک متحدہ امریکہ میں تین ملین عرب ہیں۔ ان میں ۸۰ ہزار عراق سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان عربوں کی دوسری نسل (بیٹوں اور پوتوں) میں اپنے قدیم وطن سے زیادہ گہرا لگاؤ نہیں۔ مگر پہلی نسل جو عرب سرزمین میں پیدا ہوئی تھی، وہ اپنے آبائی وطن سے بہت گہرا قلبی تعلق رکھتی ہے، ایک امریکی عرب نے کہا :

ھا انا اری وطنی الذی اخترتہ و وطنی الذی ولدتُ فیہ یتحاربان۔ ھا انا اری وطن اولادی واحفادی فی حرب مع وطن آبائی واجدادی (صفحہ ۵۸)

آج میں دیکھتا ہوں کہ جس وطن کو میں نے اختیار کیا اور جس وطن میں میں پیدا ہوا دونوں ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ میرے بیٹوں اور پوتوں کا وطن میرے باپ اور دادا کے وطن سے برسرِ جنگ ہے۔

اسی طرح عرب اصل سے تعلق رکھنے والے (نیز دوسرے ملکوں کے مسلمان) بڑی تعداد میں فرانس، برطانیہ، جرمنی وغیرہ میں آباد ہیں۔ ہر جگہ وہ اسی نفسیاتی کش مکش میں مبتلا ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں میں یہ لوگ شک کی نظر سے دیکھے جا رہے ہیں۔ مقامی باشندے ان سے نفرت کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ جگہ جگہ ان کے خلاف تشدد کے واقعات ہو رہے ہیں۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب ساری دنیا میں مسلمانوں کا وہی حال ہو جائے گا جو حال ان کا ہندستان میں ۱۹۴۷ کے بعد ہوا ہے۔ مغرب کے ترقی یافتہ ملکوں میں یہ مسلمان عزت اور خوش حالی کی زندگی گزار رہے تھے۔ مگر اب وہ ان ملکوں میں ذلت اور مشکلات کے درمیان رہنے پر مجبور ہوں گے۔ اس کی ذمہ داری اگرچہ وہ مغرب کی مفروضہ "اسلام دشمنی" کے خانہ میں ڈالیں گے۔ مگر باعتبار حقیقت اس کی ذمہ داری خود مسلم لیڈروں کے سوا کسی اور کے اوپر نہ ہوگی ــــــــ دورِ اول کے مسلمان دوسرے ملکوں میں دعوت اسلام کے لیے گئے۔ انھوں نے دوسرے ملکوں کے مسائل کو حل کیا۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان دوسرے ملکوں میں طلب معاش کے لیے گئے۔ وہ خود مسائل کا شکار ہو کر رہ گئے۔

۱۷ فروری ۱۹۹۱

ٹائمس آف انڈیا (۱۸ جنوری) کے اڈیٹوریل کی سرخی یہ تھی: پیکس امریکانا (Pax Americana) یعنی امریکی امن۔ میڈیٹیرینین کے علاقہ میں رومیوں نے وسیع سلطنت قائم کی جو ۲۰۷ ق م سے لے کر ۱۸۰ء تک رہی۔ اس زمانہ میں رومی اقتدار کے تحت اس علاقہ میں جو سیاسی امن قائم ہوا اس کو انھوں نے پیکس رومانا سے تعبیر کیا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد عالمی سیاست میں امریکہ کو غالب کردار ادا کرنے کا جو موقع ملا اس کی بنا پر اس عہد کو پیکس امریکانا سے تعبیر کیا جانے لگا۔ مگر اس دور میں امریکہ کے علاوہ سوویت یونین کو بھی سپر پاور کی حیثیت حاصل رہی۔ اس بنا پر پیکس امریکانا کا لقب صرف جزئی طور پر ہی امریکہ پر صادق آتا تھا۔ اب حالات مکمل طور پر بدل گئے ہیں۔ ٹائمس آف انڈیا نے اپنے مذکورہ اڈیٹوریل میں بالکل درست طور پر لکھا ہے کہ دو طاقتی دنیا کا نظام جس کو سرد جنگ نے پیدا کیا تھا وہ نومبر ۱۹۸۹ میں دیوار برلن کے ساتھ ڈھ گیا۔ اس کے کھنڈر سے ایک واحد طاقتی دنیا کا نظام ابھرنا شروع ہو گیا تھا۔ خلیجی جنگ نے اس عمل کو حیران کن رفتار کے ساتھ تیز کر دیا ہے :

> The bi-polar world order created by the Cold War collapsed along with the Berlin Wall in November 1989. A more and more uni-polar world began to emerge from the rubble. That process has now accelerated with dizzying speed. (p. 1)

آج ٹائمس آف انڈیا (۱۷ فروری) میں فرانسیسی مؤرخ (Amaury de Riencourt) کا انٹرویو چھپا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ صدیوں کے تاریخی عمل اور امریکہ کی غیر معمولی مادی ترقی جس طرف جا رہی ہے وہ یہی ہے کہ آنے والا دور پیکس امریکانا کا دور ہو۔ یہ امریکہ کا شاہانہ مقدر ہے کہ وہ بیسویں صدی کا روم بنے :

> It is America's imperial destiny to be the Rome of the twentieth century (p. 12).

یہ بات بطور واقعہ درست ہے۔ اب مسلمانوں کے لیے دانش مندی یہ ہے کہ وہ امریکہ کی سیاسی چٹان سے اپنا سر نہ ٹکرائیں۔ بلکہ اسلام کے دعوتی مشن کو لے کر اٹھیں۔ اگر وہ ایسا کریں تو عین ممکن ہے کہ دورِ امریکہ مستقبل میں دورِ اسلام بن جائے۔ کوئی بھی غلبہ دعوتی مواقع کو ختم نہیں کرتا۔ اور جہاں دعوتی مواقع موجود ہوں وہاں گویا وہ سب کچھ موجود ہے جس کی اسلام کو ضرورت ہے۔

## ۱۸ فروری ۱۹۹۱

ہندستان ٹائمس (۱۸ فروری) میں ایک خوش کن خبر شائع ہوئی ہے۔ واشنگٹن کی ڈیٹ لائن کے ساتھ چھپنے والی اس خبر کا عنوان ہے ——— خلیج کی جنگ کے بعد کسی بھی منصوبہ میں انڈیا اپنا رول چاہتا ہے:

India wants a role in post-war plan

خبر میں بتایا گیا ہے کہ نئی دہلی کی ہدایات کے تحت امریکہ کے ہندستانی سفیر مسٹر عابد حسین امریکہ کے سکرٹری آف اسٹیٹ (فار پولیٹکل افیرس) مسٹر رابرٹ کیمٹ (Robert Kimmit) سے ملے۔ ہندستانی سفیر نے امریکی حکومت سے یہ درخواست کی کہ جنگ کے بعد ویسٹ ایشیا کی بحالی کا جو نقشہ بنایا جائے، اس میں انڈیا کی رائے کو بھی شریک کیا جائے۔ علاقہ کی تعمیرِ نو کے پراسس میں انڈیا کا بھی بطور ایک پارٹنر شامل کیا جانا ضروری ہے۔

ہندستانی سفیر نے مسٹر کیمٹ سے کہا کہ انڈیا جیسا ایک ملک اس علاقہ میں نہایت اہم رول ادا کر سکتا ہے۔ اور امریکہ کو چاہئے کہ وہ انڈیا کی ترقی میں مزید بہت زیادہ دلچسپی لے:

> A country like India in the subcontinent has to play an extremely important role, and the US have got to take a lot more interest in India's development. (p. 12)

موجودہ حالت میں یہ درخواست محض نادانی کی ایک خواہش ہے جو کبھی پوری ہونے والی نہیں۔ اسی اخبار کے صفحۂ اول پر یہ خبر ہے کہ خلیج کے لئے جانے اور آنے والے امریکی ایرفورس کے ٹرانسپورٹ جہازوں کو بمبئی اور مدراس کے ایرپورٹ پر دوبارہ تیل لینے کی سہولت (refuelling facility) دی جارہی تھی۔ لیکن ہندستان کے سیاسی لیڈروں نے اس پر شور مچایا۔ چنانچہ حکومتِ ہند نے اس سہولت کو بند کر دیا ——— جس عمل میں انڈیا قیمۃً تیل دینے کے بقدر بھی شریک نہ ہو، وہ اس عمل کے بعد اس کے انجام کی تشکیل میں کیسے شریک ہو سکتا ہے۔

اس دنیا کا اصول یہ ہے کہ جو لوگ جوکھم کو برداشت کریں، وہی جوکھم کے بعد آنے والے نتیجہ کے مالک ہوں۔ موجودہ دنیا میں یہ ناممکن ہے کہ جوکھم کوئی اور اٹھائے اور اس کا نتیجہ کسی دوسرے کو مل جائے۔ اس قسم کی خوش فہمی صرف ایک سادہ لوح انسان کے ذہن میں جگہ پا سکتی ہے۔ اس کے باہر ایسی خوش فہمی کا کوئی وجود نہیں۔

## ۱۹ فروری ۱۹۹۱

ٹائمس آف انڈیا (۱۹ فروری) کی ایک خبر میں بتایا گیا ہے کہ بحرین کے ایک انٹرنیشنل ہوٹل میں ایک لطیفہ مشہور ہو رہا ہے کہ ایک پیٹریٹ روزانہ استعمال کرو اور اسکڈ کو دور بھگاؤ:

A Patriot a day keeps Scuds away

سوویت یونین نے اسکڈ کے نام سے خطرناک قسم کے دور مار میزائل بنائے۔ عراق نے ان کو بڑی تعداد میں خرید کر اپنے یہاں جمع کر لیا۔ عراق کے لئے ان کی حیثیت بے پناہ ہتھیار کی تھی۔ ان کے ذریعہ وہ سعودی عرب اور دوسرے عرب ملکوں پر قیامت ڈھا دیتا۔ اس نے ظہران اور ریاض وغیرہ پر بہت سے اسکڈ پھینکے۔ مگر یہ شہر تباہی سے بچ گئے۔ اس کی وجہ امریکہ کے پیٹریٹ میزائل تھے۔ جنھوں نے فضا ہی میں عراقی اسکڈ سے ٹکرا کر انھیں تباہ کر دیا۔

سوویت یونین نے جب اسکڈ بنائے تو امریکہ نے اس کے اس اہم فوجی راز کو دریافت کیا اور اس کا توڑ تیار کرنے کے لئے ریسرچ شروع کر دی۔ اسی ریسرچ کا نتیجہ پیٹریٹ تھے۔ اسکڈ جب آواز سے چھ گنا زیادہ تیز رفتار کے ساتھ فضا میں اڑتا ہے تو پیٹریٹ فوراً ہی اس کا پتہ کر لیتا ہے۔ چنانچہ جس وقت اسکڈ اپنے لانچر سے نکل کر نشانہ کی طرف چلتا ہے، عین اسی وقت پیٹریٹ بھی مخالف سمت سے اس کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ وہ پیچھا کر کے اسکڈ سے ٹکرا جاتا ہے اور اس کو نشانہ پر پہنچنے سے پہلے برباد کر دیتا ہے۔

امریکہ کی سازش اور دسیسہ کاری نہیں، بلکہ اس کی اسی قسم کی صلاحیت ہے جس نے اس کو خلیج میں آنے کا موقع دیا ہے۔ عربوں کے پاس عراقی اسکڈ کا کوئی توڑ نہ تھا۔ اس لئے وہ مجبور تھے کہ امریکہ کو دعوت دیں۔ حتی کہ اسی ٹائمس آف انڈیا میں واشنگٹن پوسٹ کے حوالہ سے یہ خبر چھپی ہے کہ آٹھ عرب ملک (مصر، شام، سعودی عرب، کویت، بحرین، عمان، قطر، عرب امارات) ابھی سے نقشہ بنا رہے ہیں کہ پندرہ بلین ڈالر سے ایک فنڈ قائم کریں اور امریکہ سے کہیں کہ جنگ کے خاتمہ کے بعد بھی اس کی بحری اور فضائی فوجیں عرب کے آفاق کے اوپر (over the horizon) محسوس طور پر باقی رہیں تاکہ عرب ملکوں کے لئے بعد کو دوبارہ کوئی سیاسی مسئلہ پیدا نہ ہو سکے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی اصل کمزوری ان کی وسائل سے محرومی ہے۔ جب تک اس کمی کو دور نہ کیا جائے اسلام دشمنوں کی سازش اور دسیسہ کاری کے خلاف احتجاج کا کوئی فائدہ نہیں۔ ایسی باتیں صرف جھنجھلاہٹ کو بڑھاتی ہیں، وہ مسئلہ کو حل نہیں کرتیں۔

۲۰ فروری ۱۹۹۱

ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوۃ (۷ فروری ۱۹۹۱) کے موضوع الغلاف کا عنوان تھا کہ خاتمہ قریب آگیا (النھایۃ تقترب) اسی طرح المجلۃ (۲۷ فروری) کی کور اسٹوری کا عنوان ہے: معرکۃ تحریر الکویت: الفصل الاخیر۔ ٹائم جس پر ۲۵ فروری کی تاریخ چھپی ہوئی ہے۔ وہ حسب قاعدہ پیشگی طور پر مجھے آج ملا۔ اس کی کور اسٹوری خلیج کی جنگ ہے اور اس کا عنوان بھی یہی قائم کیا گیا ہے کہ خاتمہ کا آغاز:

Beginning of the end

اتحادی طاقتوں کی رات دن کی مسلسل بمباری نے عراق کی دو تہائی فوجی طاقت برباد کر دی۔ عراق کے شہر اور اس کے بیشتر اہم مقامات کھنڈر ہو گئے۔ صدام حسین جو آخری فتح سے پہلے نہ رکنے کی باتیں کرتے تھے، وہ اب جنگ بندی کی پیش کش کر رہے ہیں۔ ہولناک جنگ کے یک طرفہ خاتمہ کا آغاز شروع ہو چکا ہے۔ ٹائم کے مذکورہ شمارہ میں عراق کی تباہی کی دردناک تصویریں ہیں۔ ایک تصویر میں ایک عراقی عورت اپنے تباہ شدہ مکان کے ملبہ پر سر پکڑے ہوئے بیٹھی ہے۔ ایک تصویر میں مردہ عراقیوں کی لاشیں ٹرکوں میں لاد کر لے جائی جا رہی ہیں۔ ایک تصویر میں ایک وسیع کھنڈر کے اوپر بیٹھی ہوئی دو عورتیں رو رہی ہیں۔ ایک اور بڑے کھنڈر کے اوپر ایک عراقی مایوسی اور نامرادی کی حالت میں دکھائی دے رہا ہے۔ کسی تصویر میں پل ٹوٹے ہوئے ہیں کسی میں بڑی بڑی بلڈنگیں منہدم صورت میں نظر آ رہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عراق کی یہ تباہی ۱۲۵۸ء میں تاتاریوں کے ہاتھوں ہونے والی تباہی سے ہزاروں گنا زیادہ سخت ہے۔

۳۰ اکتوبر ۱۹۹۰ کو ہندو فرقہ پرست بابری مسجد (اجودھیا) کی چہار دیواری توڑ کر اندر داخل ہو گئے اور اس کے گنبدوں پر بھگوا جھنڈا لہرا دیا۔ ملک میں وسیع پیمانہ پر فسادات پھوٹ پڑے۔ اسی کے ساتھ خلیج میں دشمن اسلام امریکہ کی فوجیں بہت بڑی تعداد میں جمع ہو گئیں۔ اب سارے ملک میں "قنوت نازلہ" پڑھی جانے لگی۔ مسلمان ہر طرف اللھم دمر دیارھم کی بددعا کرنے لگے اور تمام اکابر واصاغر نے اس پر آمین کہنا شروع کر دیا۔ یہ بددعا تمام مسجدوں اور تمام اجتماعات میں جاری تھی۔ مگر ۱۷ جنوری ۱۹۹۱ کو جب خدا کا فیصلہ ظاہر ہوا تو "تدمیر دیار" کا عمل کافروں کے بجائے خود مسلمانوں کے اوپر ہو رہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اب وہ آخری وقت آگیا ہے کہ مسلمان احتجاج غیر کا طریقہ چھوڑ دیں اور احتساب خویش کا طریقہ اختیار کریں۔

۲۱ فروری ۱۹۹۱ء

سعودی عرب کے شاہ فہد اور کویت کے امیر الصباح کی دعوت پر امریکہ اور دوسرے ۲۸ مغربی ملکوں کی فوجیں تقریباً پانچ لاکھ کی تعداد میں خلیج کے علاقہ میں جمع ہیں اور عراق صدر صدام حسین کے خلاف تباہ کن جنگ میں مصروف ہیں۔ صدام نواز مسلمان ساری دنیا میں اس پر سخت اعتراض کر رہے ہیں۔ ہندستان کے مسلم اخبارات میں اس قسم کی سرخیاں نظر آتی ہیں: اسلام عیسائیت کی چوکھٹ پر۔ عرب حکمرانوں نے کافروں کو سرزمین حرم میں داخل کر دیا، وغیرہ۔

سعودی حلقہ اس بارہ میں مختلف نقطۂ نظر رکھتا ہے۔ ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوۃ (۳۱ جنوری) میں اس سلسلہ میں الشیخ ابن باز کا فتویٰ چھپا تھا۔ اس میں انھوں نے کہا تھا کہ مسلم حکمرانوں کے لئے اس میں کوئی شرعی نقصان نہیں کہ وہ غیر اسلامی حکومتوں سے مدد لیں جب کہ انھیں ایسی مدد کی ضرورت ہو (صفحہ ۶-۷)۔ الدعوۃ (۲۱ فروری) میں دوبارہ الشیخ ابن باز کا مفصل مضمون چھپا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ غیر مسلموں سے مدد لینا جائز ہے جب کہ ظالم دشمن کو ہٹانے اور اس کو ہلاک کرنے اور بلادِ اسلامی کو اس کے شر سے بچانے کے لئے ضروری ہو، خواہ وہ غیر مسلم یہودی ہو یا عیسائی یا بت پرست۔ (سوار کان المستعان بہ یہودیا او نصرانیا او وثنیا، صفحہ ۲۱)

اصولی طور پر یہ بات درست ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو طالب، مطعم بن عدی، عبد اللہ بن اریقط وغیرہ سے مدد لی اور یہ سب غیر مسلم تھے۔ الشیخ ابن باز نے جو دلیل دی ہے یہی دلیل ہندستان کے علماء نے ۱۹۴۷ کے پہلے دی تھی جب کہ انھوں نے تحریکِ حریت میں غیر مسلموں کو اپنے ساتھ لیا تھا۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلموں سے تعاون لیا تو اس کا نتیجہ اسلام کے غلبہ کی صورت میں نکلا۔ جب کہ علماء ہند کے تعاون کا نتیجہ اس کے برعکس برآمد ہوا۔ اسی طرح یقینی ہے کہ خلیج کی جنگ کا سب سے بڑا فائدہ اسرائیل اور مغربی طاقتوں کو پہنچے گا اور سب سے بڑا نقصان عراق کو اور پھر مختلف انداز میں ساری مسلم دنیا کو۔

مدد کس کے لئے مفید ہوگی، اس کا انحصار اس پر ہے کہ مدد لینے سے پہلے کس نے اپنی بنیاد بنائی ہے۔ دورِ اول کے مسلمان خود اپنی مضبوط بنیاد پر کھڑے ہوئے تھے۔ اس لئے مدد کا فائدہ ان کے حصہ میں آیا۔ موجودہ مسلمانوں کی اپنی کوئی بنیاد نہیں، اس لئے مدد کا فائدہ بھی ان کو نہیں ملتا۔

## ۲۲ فروری ۱۹۹۱

امریکہ کی زیر قیادت اتحادی فوجوں نے ۱۷ جنوری کو عراق پر بمباری کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ اب وہ عراق کی فوجی اور اقتصادی طاقت کو تقریباً توڑ چکے ہیں۔ اندازہ کے مطابق جلد ہی وہ زمینی حملہ شروع کردیں گے جو یقینی طور پر چند دن سے زیادہ نہیں رہے گا۔ عراق کے لئے اس کے سوا کوئی صورت نہ ہوگی کہ وہ ذلت کے ساتھ ہتھیار ڈال دے (اتحادی فوجوں نے ۲۴ فروری ۱۹۹۱ء کو زبردست زمینی حملہ کرکے عراقی فوجیوں کا قتل عام شروع کردیا)

ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان میں مقیم عراقی سفیر نے کہا ہے کہ خلیج کی جنگ نے یہ ثابت کردیا ہے کہ سوویت روس اب سپر پاور نہیں رہا۔ وہ بڑی طاقت کی حیثیت سے ختم ہوچکا ہے۔ انھوں نے شکایت کی کہ روس اس جنگ میں امریکہ سے یا اقوام متحدہ سے ہمارے موافق کوئی تجویز منوانے میں کامیاب نہیں ہورہا ہے۔ عراق روس کو اپنا سب سے بڑا دوست سمجھتا تھا، مگر روس عراق کے کچھ کام آتا ہوا نظر نہیں آتا۔

لیکن عراقی سفیر کو روس کے دیوالیہ پن کے بجائے خود عراقی لیڈروں کے دیوالیہ پن کا شکوہ کرنا چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ روس اور امریکہ نے جون ۱۹۹۰ میں باقاعدہ طور پر سرد جنگ کے خاتمہ کا اعلان کردیا تھا۔ عراقی لیڈروں نے اس اعلان کی حقیقت نہیں سمجھی۔ اس کے بعد انھوں نے اگست ۱۹۹۰ میں کویت پر حملہ کرکے اس پر قبضہ کرلیا۔ عراقی لیڈروں کی کارروائیاں بتاتی ہیں کہ وہ یقین کئے ہوئے تھے کہ اس جنگ میں روس ان کی طرف سے کود پڑے گا جس طرح سرد جنگ کے زمانہ میں روس اور امریکہ ایک دوسرے کے خلاف کود پڑتے تھے۔ مگر روس کسی بھی درجہ میں عراق کی کوئی مدد نہ کرسکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سرد جنگ کا خاتمہ دونوں قوموں کے لئے برابری کا معاملہ نہ تھا۔ وہ اس بات کا مظاہرہ تھا کہ روس نے امریکہ کے مقابلہ میں سپر پاور کی حیثیت کھودی ہے۔ مگر عراق اپنی خوش فہمی کی بنا پر اس کو سمجھ نہ سکے۔

عراقی لیڈر کہہ رہے ہیں کہ اصل جنگ تو زمینی جنگ ہے۔ زمینی جنگ شروع ہوگی تو ہم یہاں کے صحرا کو امریکیوں کا قبرستان بنادیں گے۔ مگر یہ محض بے خبری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کے دور میں جنگ کا فیصلہ فضا میں ہوتا ہے اور فضا کی جنگ امریکہ جیت چکا ہے۔ اب زمینی جنگ صرف اختتامی کارروائی کے ہم معنی ہوگی نہ کہ نئی جنگ شروع کرنے کے ہم معنی۔ خوش فہمی کے گنبد میں رہنا آسان ہے۔ مشکل صرف یہ ہے کہ حقائق کا بے رحم ہاتھ جب اس کو توڑتا ہے تو گنبد تو درکنار آدمی کے قدموں کے نیچے کی اینٹ بھی نہیں ہوتی جہاں وہ اپنے آپ کو کھڑا کرسکے۔

## ۲۳ فروری ۱۹۹۱

صدام حسین ۱۷ جنوری سے پہلے، اور پھر جنگ شروع ہونے کے ابتدائی دنوں میں بڑی بڑی باتیں کرتے تھے۔ مگر امریکہ کی زیر قیادت اتحادی طاقتوں (allied forces) نے مسلسل بمباری سے عراق کی فوجی طاقت توڑ دی۔ پہلے وہ کسی بھی حال میں کویت سے اپنا قبضہ ہٹانے پر راضی نہیں تھے۔ وہ اعلان کر چکے تھے کہ کویت اب ہمیشہ کے لئے عراق کا ۱۹ واں صوبہ بن چکا ہے۔ مگر اب وہ بلا شرط کویت سے اپنی فوجیں واپس بلانے پر رضامندی کا اعلان کر رہے ہیں۔ آج اخبارات کے صفحہ اول کی پہلی خبر ان کا یہی اعلان ہے جو انھوں نے سوویت روس کے واسطہ سے کیا ہے۔ ہندستان ٹائمس (۲۳ فروری) کے پہلے صفحے کی جلی سرخی یہ ہے کہ عراق غیر مشروط واپسی پر رضامند:

Iraq agrees to unconditional pull-out

مگر اسی کے ساتھ دوسری سرخی یہ ہے کہ امریکہ نے قیام امن کی عــراقی پیش کش کو رد کر دیا ہے۔ (US rejects peace offer) ۱۷ جنوری سے پہلے جب کہ جنگ شروع نہیں ہوئی تھی، امریکہ کا مطالبہ صرف یہ تھا کہ عراق اپنی فوجوں کو کویت سے واپس بلالے۔ شاہ فہد نے اعلان کیا تھا کہ اگر صــدام حسین کویت کو خالی کر دیں تو ان سے دوبارہ برادرانہ سلوک کیا جائے گا اور ان کی ہر طرح مدد کی جائے گی۔ مگر اس وقت صدام حسین نے بے نیازانہ طور پر اس کو رد کر دیا۔ اب باری امریکہ اور اس کے حلیفوں کی ہے۔ اب جبکہ عملاً وہ جنگ جیت چکے ہیں، اب وہ صدام حسین کو کچلنے سے کم کسی چیز پر راضی ہونے والے نہیں۔

صدام حسین کا موجودہ جھکاؤ صرف ان کی نادانی کو ظاہر کرتا ہے۔ دانش مند آدمی جو کچھ کرتا ہے وہی بیوقوف آدمی بھی کرتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ دانش مند آدمی تباہی سے پہلے کرتا ہے اور بیوقوف آدمی تباہی دیکھنے کے بعد۔ اسی لئے فارسی شاعر نے کہا ہے کہ آدمی ایسا اقدام کیوں کرے جس کا نتیجہ شرمندگی ہو:

چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی

اقدام وہ ہے جو کسی حقیقی نتیجہ تک پہنچے۔ جو اقدام صرف بربادی پر ختم ہو وہ خودکشی کی چھلانگ ہے نہ کہ کوئی واقعی اقدام۔ بدقسمتی سے موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما تقریباً سب کے سب اسی قسم کے جھوٹے اقدام میں مشغول نظر آتے ہیں۔ ان کے غیر حقیقت پسندانہ اقدامات نے مسلمانوں کو کچھ فائدہ تو نہیں پہنچایا۔ البتہ ان کی بربادی میں مزید اضافہ کر دیا۔

## ۲۴ فروری ۱۹۹۱

ٹائم میگزین (۴ فروری) میں ایک رپورٹ چھپی تھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ امریکہ میں کچھ لوگ ہیں جو خلیج کی جنگ میں شریک ہونا نہیں چاہتے۔ افریقی امریکن (سیاہ فام) جو سفید فام نسل سے نفرت کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ یہ سفید فام لوگوں کی برتری قائم کرنے کی جنگ ہے۔ اس لئے ہم کو اس میں شریک نہیں کیا جانا چاہئے (صفحہ ۳۹) یہی معاملہ امریکی مسلمانوں کا ہے۔ ان کے نزدیک امریکہ ایک اسلام دشمن ملک ہے۔ وہ موجودہ جنگ کو کافر اور مسلم کی جنگ سمجھتے ہیں۔ اس لئے وہ بھی جنگ میں شرکت کے خلاف ہیں (ٹائمس آف انڈیا ۱۳ فروری، صفحہ ۶)

ٹائم (۲۵ فروری) میں کوریا کے ایک شہری ڈیوڈ اسکاٹ (David E. Scott) کا خط اس کے جواب میں چھپا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ امریکی شہریت اختیار کرنے کے بعد کسی شخص کے لئے ایسا کہنا درست نہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ میرا ایک لڑکا امریکی ہے۔ یہ واقعہ کہ وہ کوریا میں پیدا ہوا تھا، اس سے اس کی یہ ذمہ داری ختم نہیں ہوتی کہ وہ اس ملک کا دفاع کرے۔ اگر آپ فائدوں کو قبول کریں تو آپ کو ذمہ داریوں کو بھی قبول کرنا ہوگا:

> My son is an American. The fact that he was born Korean does not in any way diminish his responsibility to defend this country. If you accept the benefits you must also accept the responsibilities (p. 8)

میں سمجھتا ہوں کہ کوریا کے مراسلہ نگار نے جو بات کہی ہے وہ عین درست ہے۔ جب آپ ایک ملک کے شہری بنیں اور اس کی مطلق وفاداری اور اس کے دفاع کا عہد کریں تو آپ کی ذمہ داری ہو جاتی ہے کہ خارجی وفاداریوں کو ترک کر کے صرف اس کے وفادار بنیں اور بوقتِ ضرورت اس کی طرف سے لڑیں۔ کسی شخص کو یہ حق تو ہے کہ وہ ایسے ملک سے اپنی شہریت کو ختم کر دے اور وہاں سے ہجرت کر جائے مگر شہری رہتے ہوئے ایسا کرنا درست نہیں۔

یہ نہایت سطحیت اور گراوٹ کی بات ہے کہ آدمی فائدہ کو تو لے لے، مگر وہ ذمہ داریوں کو لینے کے لئے تیار نہ ہو۔ ذمہ داریوں کو اٹھانا ہی وہ قیمت ہے جس سے فائدوں کو لینے کا استحقاق پیدا ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص ذمہ داریوں کو اٹھانے سے انکار کرے تو فائدوں کو لینے کے لئے بھی اس کا استحقاق ختم ہو جائے گا۔

۲۵ فروری ۱۹۹۱

ریڈرس ڈائجسٹ (فروری ۱۹۹۱) نے چھ صفحہ کی ایک رپورٹ چھاپی ہے اس کے لکھنے والے مسٹر فلک (Rachel Flick) ہیں۔ اس میں تفصیل کے ساتھ دکھایا گیا ہے کہ مغرب نے کس طرح صدام حسین کو بیوقوف بناکر عراق کی دولت کو لوٹا۔ عراق کا تیل اور اس کی ۴۵ بلین ڈالر کی سالانہ آمدنی کا بیشتر حصہ مغربی ملکوں کو پہنچتا رہا۔ پچھلے ۲۰ سال سے عراق بیرونی فوجی ہتھیاروں کی خریداری پر ۱۴ ہزار بلین ڈالر سالانہ خرچ کرتا رہا ہے۔ مغربی ٹھیکہ داروں کے ذریعہ صدام حسین نے اپنی ایرفورس کے لئے بے شمار نہایت مہنگے انڈر گراؤنڈ بیس تیار کرائے۔ وغیرہ

صدام حسین کو عرب لیڈر بننے کا جنون تھا۔ اس جنون کو مغرب نے استعمال کیا۔ اس نے عراق سے سستا تیل خریدا اور اس کو نہایت مہنگے ہتھیار فروخت کئے۔ اس طرح یہ خود مغرب ہے جس نے صدام حسین کو اپنے تجارتی اغراض کے لئے مسلّح کیا۔ اسی کے ساتھ اس کا ایک سیاسی مقصد بھی تھا۔ مغرب یہ سمجھتا تھا کہ عراق اپنی فوجی طاقت کو ایران کے خلاف استعمال کرے گا، وہ اس کے دشمن کے خلاف ہتھیار ثابت ہوگا۔

مگر صدام حسین کو اپنے ڈکٹیٹرانہ مزاج کی وجہ سے حقائق کی بالکل خبر نہ تھی۔ انھوں نے ایران پر حملہ اور کویت پر حملہ کے فرق کو نہیں سمجھا۔ ایران پر حملہ مغرب کو عین مطلوب تھا مگر کویت پر حملہ مغرب کے لئے عین غیر مطلوب تھا، کویت پر حملہ کرکے صدام حسین نے خود مغرب کے مفاد پر حملہ کر دیا۔ چنانچہ سارے مغرب نے متحدہ طور پر طے کیا کہ صدام حسین کو کچل دیا جائے۔

مذکورہ مضمون میں لندن کے پروفیسر کوپٹز (Hans-Heino Kopietz) کا تبصرہ نقل کیا گیا ہے انھوں نے کہا کہ ہم نے (مغربی حکومتوں نے) اس معاملہ میں اپنی آنکھیں بند کرلیں اس لئے کہ اس سے ہم کو تجارتی فائدہ تھا۔ اور اس لئے کہ صدام ایران کے خلاف ہمارے لئے ایک مفید حربہ تھے۔ صدام ایک ایسا عفریت ہے جس کو خود مغرب نے پیدا کیا:

> We closed our eyes because some business wanted to make money and because Saddam was a useful tool against Iran. Saddam is a Frankenstein monster that the West created. (150)

صدام اگر قومی تعمیر کا منصوبہ بناتے۔ وہ مغرب کے ذریعہ اپنی زراعت اور صنعت کو ترقی دیتے۔ وہ لوگوں کو تعلیم یافتہ بناتے تو عراق کا مستقبل اس سے مختلف ہوتا جو آج وہاں دکھائی دے رہا ہے۔

۲۶ فروری ۱۹۹۱ء

قومی آواز (۲۶ فروری) میں خلیج کی جنگ کے مابعد اثرات کے بارہ میں ایک جائزہ شائع ہوا ہے۔ اس کا ایک پیراگراف یہ ہے: نئی دہلی کے ایک سعودی ڈپلومیٹ نے اس نامہ نگار سے گفتگو کے دوران عالمی مسلم رائے عامہ میں تبدیلی پر انتہائی برگشتگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ جنگ کے خاتمہ پر سعودی عرب دنیا کی مختلف سرکردہ مسلم جماعتوں اور تنظیموں کے متعلق اپنی پالیسی پر نظر ثانی کرے گا۔ کیوں کہ یہ تمام جماعتیں اور تنظیمیں سعودی موقف کے حق میں عوامی حمایت حاصل کرنے میں ناکام ثابت ہوئی ہیں (صفحہ ۷)

سعودی عرب نے تمام دنیا کی مسلم جماعتوں کو غیر معمولی مالی امداد دی۔ مگر خلیج کے بحران کے زمانہ میں تقریباً ہر ملک کے مسلم عوام سعودی عرب کو چھوڑ کر صدام حسین کے حامی بن گئے۔ حالانکہ اس معاملہ میں سعودی عرب کی حیثیت دفاع کرنے والے کی تھی اور صدام حسین کی حیثیت جارح اور ظالم کی۔ اس کی وجہ مسلم رہنماؤں کی جذباتی سیاست ہے۔ ان رہنماؤں کا مفاد اس میں تھا کہ وہ عوام کی بھیڑ جمع کریں تاکہ عرب ملکوں کی نظر میں ان کی یہ حیثیت قائم ہو کہ مسلم عوام ان کے ساتھ ہیں۔ مسلم رہنماؤں کا یہ قیادتی تقاضا انھیں اس طرف لے گیا کہ وہ جذباتی نعروں کا استعمال کریں۔ کیوں کہ عوام کی بھیڑ صرف جذباتی نعروں پر ہی جمع کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے فلسطین کے اشو کو خوب بڑھا چڑھا کر عوام کے سامنے پیش کیا۔ زبان و قلم کی ساری طاقت یہ ثابت کرنے پر لگا دی کہ امریکہ سب سے بڑا اسلام دشمن ہے۔

اس طرح مسلمانوں کے جذبات اسرائیل کے بارہ میں اور امریکہ کے بارہ میں شدت کے ساتھ بھڑک اٹھے۔ وہ اس معاملہ میں آخری حد تک حساس ہو گئے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ صدام حسین سب سے بڑے دشمنِ اسلام (امریکہ) کو چیلنج کر رہا ہے۔ وہ ظالم اسرائیل پر اسکڈ میزائل مار رہا ہے۔ اور اسرائیل کے سرپرستوں سے کہہ رہا ہے کہ ہوش میں آجاؤ۔ کیوں کہ سلطان صلاح الدین ایوبی دوبارہ زندہ ہو گیا ہے۔ صدام حسین کے یہ الفاظ مسلمانوں کی موجودہ نفسیات کے اعتبار سے بالکل جادو ثابت ہوئے۔ انھیں دکھائی دیا کہ سعودی عرب اسلام کے دشمن نمبر ایک کا ساتھ دے رہا ہے اور صدام حسین اسلام کے دشمن نمبر ایک کو سمندر میں غرق کرنے کا نعرہ لگا رہا ہے، تو وہ اپنی مذکورہ نفسیات کی بنا پر سعودی عرب کو چھوڑ کر صدام حسین کی طرف دوڑ پڑے ــــــ کسی مسئلہ پر قوم کو غیر متناسب حد تک حساس بنانا شخصی قیادت کے لئے بہت کارآمد ہے۔ مگر خود قوم کے لئے وہ تباہ کن حد تک غیر مفید ہے۔

۲۷ فروری ۱۹۹۱

المجلۃ (۲۷ فروری ۱۹۹۱) میں دکتور علی الدین ہلال (مدیر مرکز الدراسات السیاسیۃ بجامعۃ القاہرۃ) کا مضمون چھپا ہے۔ یہ خلیجی بحران کے اسباب کے بارہ میں ہے۔ اس کا عنوان ہے: فلنتدبر الاسباب ونحن فی قلب العاصفۃ۔

وہ لکھتے ہیں کہ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم معاملات کو محض ان کے ظاہری پہلو کے اعتبار سے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ اور جڑ کی اور گہرائی کی باتوں پر غور نہیں کرتے۔ ہم سب کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے آپ کو اس عقل سے مسلح کریں جو ہم کو اس قابل بنائے کہ ہم خلیج اور اس کی قوموں کے مسائل کا مقابلہ زیادہ گہرے انداز میں کر سکیں (اننا ناخذ الامور عادۃ بمظاھرھا ولا نبحث فی الجذور والاعماق...... والمطلوب منا جمیعا ان نتسلح بالعقل الذی یمکننا من مواجھۃ مشاکل المنطقۃ وشعوبھا بشکل جوھری وجذری (صفحہ ۲۳)

اصولاً یہ بات نہایت اہم ہے۔ مگر موجودہ شکل میں وہ بالکل بے فائدہ ہے۔ قوم کے اندر مطلوبہ عقل پیدا کرنے کی لازمی شرط یہ ہے کہ تنقید کی کھلی آزادی ہو۔ تنقید سے میری مراد المجلہ کے مذکورہ مضمون جیسی عمومی تنقید نہیں بلکہ متعین اور مشخص تنقید ہے۔ اور موجودہ مسلمانوں کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض چیز یہی تنقید ہے۔ جب تک متعین اور مشخص تنقید کے بارہ میں مسلمانوں کی غیر ضروری حساسیت کو ختم نہ کیا جائے، ان کے اندر عقلی بالیدگی پیدا ہونا ممکن نہیں۔

مثال کے طور پر خلیج کے معاملہ کو لیجئے۔ اس کی جڑ یہ ہے کہ آج پوری مسلم دنیا میں یہ مزاج بن گیا ہے کہ ظالمانہ کارروائی کی زد غیر پر پڑے تو اس کی مذمت نہیں کی جاتی۔ کسی ظالمانہ کارروائی کی مذمت صرف اس وقت کی جاتی ہے جب کہ اس کی زد خود اپنے آپ پر پڑ رہی ہو۔ صدام حسین نے ۷ ستمبر ۱۹۸۰ کو ایران پر بمباری کی تو عرب حلقہ نے اس کی مذمت نہیں کی۔ اسی صدام نے ۲ اگست ۱۹۹۰ کو کویت پر حملہ کیا تو پورا عرب حلقہ چیخ اٹھا۔ یہ مزاج برائی کی جڑ ہے۔ لیکن اگر اس برائی کی کھلی نشاندہی کی جائے تو مقدس ترین لوگ بھی اس کو سننے کے لئے تیار نہ ہوں گے۔

اس مزاج کو باقی رکھتے ہوئے تسلح بالعقل کی بات کرنا محض ایک خوش خیالی ہے۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

## ۲۸ فروری ۱۹۹۱

ٹائم میگزین کا شمارہ جس میں ۴ مارچ ۱۹۹۱ کی تاریخ چھپی ہوئی ہے، وہ پیشگی طور پر مجھے آج ملا۔ اس شمارہ میں حکومت روس کے ایڈوائزر پرائماکوف (Yevgeni Primakov) کی ایک تازہ تحریر شائع ہوئی ہے جو صدام حسین اور خلیج کے مسئلے سے متعلق ہے۔

مسٹر پرائماکوف لکھتے ہیں کہ میں صدام حسین سے بار بار ملا ہوں۔ سب سے پہلے صدام حسین سے میری ملاقات ۱۹۶۹ میں ہوئی جب کہ میں پراودا کا کرسپانڈنٹ تھا۔ اس وقت صدام حسین بعث پارٹی کے لیڈر تھے، مگر ابھی وہ عراق کے صدر نہیں بنے تھے۔ صدام حسین کے صدر بننے کے بعد ان سے میری بار بار ملاقاتیں ہوئیں، بغداد میں بھی اور ماسکو میں بھی۔ حتی کہ میرے اور ان کے درمیان بے تکلفانہ تعلقات ہو گئے، فروری ۱۹۹۱ میں وہ میخائیل گورباچوف کے نمائندہ کی حیثیت سے کئی بار صدام حسین سے ملے اور عراقی صدر کو کویت سے اپنی فوجیں واپس کرنے کے معاملہ میں بات کی۔

مسٹر پرائماکوف کہتے ہیں کہ صدام حسین سے قریبی تعلق کے بعد میں نے جانا کہ صدام حسین کو پوری بات سے واقفیت نہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے موافق رپورٹوں کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں، مثال کے طور پر، عرب دنیا میں عراق کی حمایت کے بارہ میں، مغرب میں جنگ کے مخالف مظاہروں کے بارہ میں، عراق کے خلاف اتحادی ملکوں میں اندرونی اختلاف کے بارہ میں۔ اور جہاں تک بری خبروں کا تعلق ہے تو ایسی خبر لانے والے کو بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے:

> I realized that it was possible Saddam did not have complete information. He gave priority to positive reports: for example, about the support Iraq was receiving in the Arab World, about the antiwar demonstrations in the West, about the first hints of differences between the allies in the anti-Iraqi coalition. And as for bad news, the bearer could pay a high price.

یہی کمزوری تمام مسلم رہنماؤں میں پائی جاتی ہے، حتی کہ مسلمانوں کے مقدس اکابر میں بھی۔ یہ لوگ اپنے فرضی تخیلات میں گم رہتے ہیں۔ ان کو ایسے ہی افراد پسند آتے ہیں جو ان کے مفروضات کی تصدیق کریں۔ جو شخص ان سے اختلافی بات کرے وہ ان کی نظر میں فوراً مبغوض ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ حقیقت حال سے بالکل بے خبر رہتے ہیں۔ وہ ایسے غیر پختہ اقدامات کرتے ہیں جن کا نتیجہ بربادی کے سوا کسی اور صورت میں نکلنے والا نہ ہو۔

## یکم مارچ ۱۹۹۱

خلیج کی جنگ احمقانہ اقدام پر شروع ہوئی اور آخر کار بدترین شکست پر ختم ہوگئی۔ آج کے اخبارات عبرتناک خبروں سے بھرے ہوئے ہیں۔ ٹائمس آف انڈیا (یکم مارچ) نے نہایت جلی حرفوں میں اپنے پہلے صفحہ پر یہ سرخی قائم کی ہے کہ خلیج کی جنگ ختم (Gulf war ends) اس کے ساتھ سات کالمی تصویر ہے جس میں عراق کے جنگی قیدی بڑی تعداد میں ٹرکوں میں بھرے ہوئے ہیں اور امریکی سپاہی ان کو مخصوص کیمپوں کی طرف لے جارہے ہیں۔ یہ تصویر اس بات کا اعلان ہے کہ یہ شکست بھی تھی اور اسی کے ساتھ ذلت اور رسوائی بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ میں "رسواکن شکست" کا اتنا بڑا واقعہ اس سے پہلے کبھی پیش نہیں آیا۔ اس منظر کو دیکھ کر مجھے وہ واقعہ یاد آگیا جو ۵۸۶ ق م میں بنی اسرائیل کے اوپر بنوکدنضر (Nebuchadrezzar II) کے ہاتھوں گزرا تھا۔ اس کا ذکر قرآن (بنی اسرائیل ۵) میں مختصر طور پر اور بائبل میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ اس سلسلہ میں بائبل کی کتاب یرمیاہ کا مطالعہ نہایت عبرت انگیز ہے۔

امریکہ کے زیر قیادت اتحادیوں کے طاقتور جہازوں نے رات دن بمباری کرکے عراق کی اقتصادیات کو تباہ کردیا۔ عراق کی زمین کے نیچے دنیا کے تیل کے ذخیرہ کا دس فی صد موجود ہے۔ تیل کے ذریعہ اس کی آمدنی ۴۵ بلین ڈالر سالانہ تھی۔ مگر اب یہ حال ہے کہ عراق کے شہروں میں لوگ سڑکوں پر ٹوٹی پھوٹی چیزیں جمع کرتے ہوئے نظر آتے ہیں تاکہ اس سے اپنے چولہے کو جلائیں۔ عراق کو تباہ کرنے کے بعد اتحادی فوجوں نے عراق اور کویت کے درمیان سپلائی لائن کاٹ دی۔ کویت میں مقیم عراقی فوج بالکل بے سہارا ہوگئی اور صرف دو دن کی زمینی کارروائی میں ہتھیار ڈال کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ ایک لاکھ سے زیادہ فوجی مارے گئے۔ ۳۰ ہزار قیدی بنائے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ روایتی ہتھیاروں اور "ہائی ٹیک" کے درمیان مقابلہ تھا جس میں روایتی ہتھیاروں کو لازماً شکست کھانا تھا۔

جنگ میں تمام دنیا کے مسلمان صدام کے حامی بن گئے تھے۔ اس اعتبار سے صدام کی شکست ساری دنیا کے مسلمانوں کی شکست ہے۔ عراقی لیڈروں نے اور دنیا بھر کے مسلمانوں نے اس نادانی کے ذریعہ اپنے آپ کو خود اپنے ہاتھوں رسوا کرلیا ہے۔ اس واقعہ پر یہ حدیث صادق آتی ہے کہ: کسی مومن کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل کرے۔ پوچھا گیا کہ کوئی شخص خود اپنے کو کیوں کر ذلیل کرے گا۔ فرمایا کہ وہ ایسے فتنہ کا سامنا کرے جس سے نپٹنے کی طاقت اس کے اندر نہ ہو (مشکاۃ المصابیح ۲/۱۱۷۷)

RNI 28822/76 □ May 1991 No. 174 □ Rs. 5

# عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

## مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

| کتاب | قیمت |
|---|---|
| تذکیر القرآن جلد اول | Rs 150/- |
| 〃 〃 جلد دوم | 150/- |
| اللہ اکبر | 40/- |
| پیغمبر انقلاب | 35/- |
| مذہب اور جدید چیلنج | 40/- |
| عظمت قرآن | 25/- |
| دین کامل | 45/- |
| الاسلام | 35/- |
| ظہور اسلام | 35/- |
| اسلامی زندگی | 25/- |
| احیاء اسلام | 20/- |
| راز حیات (مجلد) | 55/- |
| صراط مستقیم | 35/- |
| خاتون اسلام | 40/- |
| سوشلزم اور اسلام | 35/- |
| اسلام اور عصر حاضر | 25/- |
| حقیقت حج | 30/- |
| اسلامی تعلیمات | 25/- |
| اسلام دور جدید کا خالق | 20/- |
| رشدیات | |
| تعمیر کی طرف | 8/- |
| راہ عمل | 25/- |
| تبلیغی تحریک | 20/- |
| میوات کا سفر | 30/- |
| اقوال حکمت | 20/- |
| تعبیر کی غلطی | 45/- |

| کتاب | قیمت |
|---|---|
| دین کی سیاسی تعبیر | 15/- |
| دین کیا ہے | 4/- |
| قرآن کا مطلوب انسان | 10/- |
| تجدید دین | 15/- |
| اسلام دین فطرت | 5/- |
| تعمیر ملت | 5/- |
| تاریخ کا سبق | 5/- |
| مذہب اور سائنس | |
| عقلیات اسلام | 30/- |
| فسادات کا مسئلہ | 4/- |
| انسان اپنے آپ کو پہچان | 4/- |
| تعارف اسلام | 4/- |
| اسلام پندرھویں صدی میں | 4/- |
| راہیں بند نہیں | 5/- |
| ایمانی طاقت | 5/- |
| اتحاد ملت | 5/- |
| سبق آموز واقعات | 5/- |
| زلزلۂ قیامت | 7/- |
| حقیقت کی تلاش | 5/- |
| پیغمبر اسلام | 4/- |
| آخری سفر | 5/- |
| اسلامی دعوت | 5/- |
| خدا اور انسان | 5/- |
| حل یہاں ہے | 8/- |
| سچا راستہ | 4/- |
| دینی تعلیم | 5/- |

| کتاب | قیمت |
|---|---|
| حیات طیبہ | 5/- |
| باغ جنت | 5/- |
| نار جہنم | 5/- |

الرسالہ کیسٹ

| کیسٹ | قیمت |
|---|---|
| نمبر۱ ایمان | 25/- |
| نمبر۲ جدید امکانات | 25/- |
| نمبر۳ اسلامی اخلاق | 25/- |
| نمبر۴ اتحاد | 25/- |
| نمبر۵ تعمیر ملت | 25/- |
| نمبر۶ سنت رسول | 25/- |
| نمبر۷ میدان عمل | 25/- |
| نمبر۸ پیغمبرانہ رہنمائی | 25/- |
| الرسالہ مجلد فی جلد | 75/- |

| Book | Price |
|---|---|
| God Arises | Rs 60/- |
| Muhammad The Prophet of Revolution | 65/- |
| Religion and Science | 30/- |
| Tabligh Movement | 20/- |
| The Way to Find God | 5/- |
| The Teachings of Islam | 6/- |
| The Good Life | 6/- |
| The Garden of Paradise | 6/- |
| The Fire of Hell | 6/- |
| Muhammad The Ideal Character | 5/- |
| Man Know Thyself! | 5/- |
| इन्सान! अपने आपका पहचान | 3/- |
| सच्चाई की तलाश | 5/- |
| पैग़म्बरे-इस्लाम | 3/- |

Delhi Postal Regd No. D(SE)243
U(SE)12/86